تشدّد

تاریخی تناظر میں

غالب احمد

مشعل

تشدّد
تاریخی تناظر میں

غالب احمد

مشعل
آر۔ بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور 54600' پاکستان

فہرست

ابتدائیہ

انسانی زندگی کے کسی پہلو کا بھی مطالعہ اگر معاشرتی، علمی اور معروضی سطح پر کرنا مقصود ہو تو یہ کام کسی قدر مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ آپ کو جدید علوم کی روشنی میں مختلف اطراف کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ افراد کی زندگیوں سے لے کر خاندان اور قبیلے تک پھر لسانی اور علاقائی حد بندیوں سے آگے ملک وقوم اور تمام انسانی معاشرے تک بات جا پہنچتی ہے اور پھر جدید دور میں مختلف علوم کی اپنی اپنی شیرازہ بندیاں ہیں اور مختلف مدرسہ ہائے فکر ونظر ہیں۔ ایک طرف نفسیات، عمرانیات، معاشیات اور دیگر معاشرتی علوم کے دائرہ کار اور دوسری طرف طبعی علوم یعنی طبعیات، فزیالوجی اور نیورالوجی کے ساتھ ساتھ جنیٹکس کے نئے نئے رنگ اور ڈھنگ۔ یہ سب علوم آپ کے مطالعے پر اثر انداز ہونے کا جواز رکھتے ہیں۔ انسانی معاشرتی زندگی کے کسی شعبے یا پہلو کا مطالعہ اور محاسبہ ان علوم کی روشنی کے بغیر کسی طرح بھی مستند قرار نہیں پا سکتا۔

اس کتاب میں ''تشدد'' کا علمی اور تاریخی مطالعہ پیش نظر ہے جس سے ہم اپنے ملکی حالات کا تشدد کے حوالے سے معروضی سطح پر جائزہ لے سکیں گے اور رائے قائم کر سکیں گے کہ تشدد ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر کس طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ ان مسائل کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ''تشدد'' کی ماہیت اور اسکے عناصر کا جائزہ لیں۔ ''تشدد'' سے ہماری مراد کیا ہے؟ عرف عام میں تشدد کسے کہتے ہیں؟ تشدد انسانی زندگی میں کس طرح رونما ہوتا ہے؟ اس کے انفرادی سماجی، نفسیاتی، سیاسی اور تاریخی پہلو کیا کیا ہیں؟ انسانی زندگی میں اس کی اہمیت کیا رہی ہے۔ ہمارے اس جدید دور میں تشدد کا رجحان کیوں روز بروز بڑھ

رہا ہے۔ تشدد ایک سیلاب یا طوفان کی صورت میں تمام انسانی معاشرے کو کس طرح اپنی مہلک لپیٹ میں لے رہا ہے۔ کیا مشرق اور کیا مغرب، کیا شمال اور کیا جنوب، تمام اکناف عالم میں تشدد ایک سنگین وبا کی طرح پھوٹ پڑا ہے۔ تشدد مختلف شکلوں اور رنگوں میں ہیجان اضطراب، تشویش، دکھ، اذیت، اشتعال، ہنگامہ آرائی، جرائم، دہشت گردی اور خونریزی کو پھیلاتے ہوئے نت نئے مسائل اور مہلک وسائل کے ساتھ ہماری معاشرتی زندگی پر مسلط ہوتا جا رہا ہے۔ شدید ذہنی اور جذباتی دباؤ ہمارے اعصاب پر، انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس حد تک اثر پذیر ہو رہے ہیں کہ ہم قومی سطح پر رفتہ رفتہ مفلوج ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم پر بے حسی کی سی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔ جو مہلک اثرات کی حامل ہے۔ ہمارے ملک میں ہر قسم کا تشدد روا رکھا جا رہا ہے۔ انفرادی سطح پر اور اجتماعی سطح پر بھی۔ تشدد جسمانی بھی ہے، لسانی بھی ہے۔ ذرائع ابلاغ میں بھی رونما ہے اور ہماری معاشرتی زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ چاہے آپ اسے مذہبی تشدد اور فرقہ واریت اس کا نتیجہ قرار دیں، یا اس کی وجوہات علاقائی، نسلی، قومیت یا کسی اور مخصوص عصبیت کی کرشمہ سازی میں تلاش کریں۔

ہمارے ملک میں ہی تشدد کا دور دورہ نہیں تمام انسانی معاشرے اس وقت تشدد کے عذاب میں مبتلا نظر آ رہے ہیں۔ دہشت گردی، تخریب کاری، جرائم کی کثرت قتل و غارت گری کا بازار ہر سو گرم ہے۔ بڑے بڑے متمدن اور خوشحال ملک جن کو مغربی تہذیب کا نمائندہ قرار دے سکتے ہیں اور جنہیں اپنی اخلاقی اقدار اور تعلیمی معیار پر فخر ہے "تشدد" کے ہاتھوں اس طرح مجبور و معذور نظر آتے ہیں کہ انسانی عقل حیرت زدہ رہ جاتی ہے کہ آخر ان ملکوں کے تہذیب یافتہ طبقوں میں کیوں اور کیسے صبر و تحمل کا فقدان ہے۔ منفی رویے، ناروا سلوک، بے صبری، کم حوصلگی، تنگ نظری، ایک دوسرے سے نفرت اور نخوت کا سلوک۔ جرائم کی شرح میں بے حد اضافہ، فراخ دلی اور وسعت قلبی کا مفقود ہو جانا اور چھوٹے چھوٹے اغراض و مقاصد کے لئے سر بازار لوگوں کے جان و مال سے کھیلنا اور شہری حقوق کا پامال کرنا روز مرہ کا معمول بن کر رہ گیا ہے۔ امریکہ، کینیڈا، فرانس اور جرمنی جیسے ملکوں میں جرائم کی شرح جس طرح ہر سال بڑھ رہی ہے، اس کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی آسیب ہے جو ان ملکوں کی معاشرتی زندگی پر سوار ہو گیا ہے اور یہ سب کچھ ان ممالک میں ہو رہا ہے جہاں تعلیم کی شرح تقریباً سو فیصد ہے اور جو بہترین ترقی یافتہ ممالک میں شمار کیے جاتے

ہیں۔ ہمارے جیسے ترقی پذیر اور پسماندہ ملکوں کی بات تو الگ ہے۔ ہم تو کئی لحاظ سے محرومیوں، مایوسیوں اور غربتوں کا شکار ہیں۔ ہمارے مختلف طبقات کے معاشی اور معاشرتی سطح پر سنگین مسائل ہیں۔ ایک دوسرے سے نفرتیں بھی ہیں اور شکایتیں بھی۔ جن کا اظہار مختلف رنگوں میں ''تشدد'' کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ جو کبھی سیاسی ہوتا ہے اور کبھی مذہبی یا لسانی یا نسلی۔ یا پھر انفرادی سطح پر مختلف جرائم کی شکل میں تشدد کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔

کرہ ارض کے شمال اور مغرب میں یورپی ممالک میں تشدد کا بے محابا فروغ اور بردباری کا فقدان حیرت انگیز ہے۔ ان ممالک کو ٹھنڈے دل و دماغ والے ممالک قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن انہی ممالک میں انفرادی سطح پر جرائم کے اعداد و شمار میں ہر سال اضافہ اس برق رفتاری سے ہو رہا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مادی زندگی کی تمام آسائشیں میسر ہونے کے باوجود ایک اذیت ناک اضطراب کی صورت رونما ہے۔ ''خودکشی'' کی شرح ان ممالک میں دوسروں کی نسبت بہت زیادہ ہے اور اس کے ساتھ اخلاقی جرائم کی سطح میں بھی کچھ اس طرح اضافہ ہو رہا ہے کہ تعلیم کے تمام ارفع مقاصد ناکام ہوتے نظر آ رہے ہیں۔

اب دوسری طرف اگر ہم ان خطوں پر نظر دوڑائیں جن کو ایشیا کے عظیم براعظم میں مذاہب کی آماجگاہ قرار دیا جاتا ہے مثلاً برصغیر پاک و ہند اور جنوب مشرقی ایشیا کے وہ تمام ممالک جن میں بدھ مت اور کنفیوشس کی صلح آشتی والے مذاہب اور ادیان کا زور رہا ہے۔ یہ تمام خطے امن و آشتی اور گیان دھیان کے فروغ کے زبردست داعی رہے ہیں۔ یہاں پر اعلیٰ اخلاقیات پر مبنی مذاہب اور مذہبی اقدار نے ہمیشہ نشوونما اور ترقی پائی۔ کنفیوشس کی تعلیمات ہوں کہ ہندومت بدھ مت کہ عیسائیت یا پھر اسلام اور صوفیا کرام کے سلسلے۔ اسی طرح بڑے بڑے بھگتوں کے نام اور کام، سور داس ہو کہ تلسی داس۔ میرا بائی ہو کہ بابا گرونانک۔ بابا فرید ہوں کہ بلھے شاہ، سچل سرمست ہوں کہ خوش حال خاں خٹک۔ ان سب کے باوجود انہی ملکوں میں یعنی لاؤس سے لے کر برما اور سری لنکا تک اور پھر بنگلہ دیش سے لے کر ہندوستان پاکستان اور افغانستان تک۔ تشدد، انفرادی جرائم سے لے کر لسانی، علاقائی، نسلی، مذہبی اور سیاسی بنیادوں پر ہر جگہ خون کی ہولی کھیلتا دکھائی دیتا ہے۔

پچھلے پچاس ساٹھ سال میں برصغیر پاک و ہند میں تشدد کی سطح خوفناک حد تک اتنی تیزی کے ساتھ بلند ہوئی ہے کہ ہمارے لیے ان سماجی عوامل کا جائزہ لینا ضروری ہو گیا

ہے۔ بے شک ان میں مذہبی رجحانات بھی شامل ہیں اور نفسیاتی وجوہات کا دخل بھی لازمی ہو گا۔ لسانی اور علاقائی گروہ بندیوں اور سیاسی مقاصد کا بھی اپنا اپنا حصہ ہو گا۔ اقتصادی زبوں حالی، آبادی میں بے پناہ اضافہ، تعلیم اور خواندگی کی شرح میں سست روی اور اخلاقی اقدار کی گراوٹ اور ان جیسے اور بھی کئی عوامل شامل ہونگے لیکن اس کے برعکس اگر آپ مغرب میں بوسنیا اور چیچنیا کی مثالیں لیں تو تعلیم اور شرح خواندگی کی شرح تو وہاں ۸۵٪ سے تقریباً سو فیصد تک ہے۔ لیکن مذہبی، لسانی اور نسلی تشدد کی جو قیامت وہاں برپا ہے، اس کے اسباب کا آپ کیسے محاسبہ کریں گے۔ تشدد کرنے والے اور تشدد سہنے والے تمام پڑھے لکھے لوگ ہیں، بہت مہذب اور شائستہ ایک زمانہ ان کی اعلیٰ اخلاقی اقدار کا قائل رہا ہے۔ لیکن وہاں جس درندگی کے ساتھ نسلی تشدد اور غارت گری روا رکھی گئی ہے، اس سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات میں بعض لاشعوری عناصر اس طرح کارفرما ہوتے ہیں کہ آپ عقلی اور ذہنی سطح پر ان عوامل کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔

یورپ سے ذرا وسط ایشیا کے ممالک کی طرف لوٹ آیئے۔ ایران، عراق، فلسطین، اسرائیل، الجزائر، سوڈان اور پھر براعظم افریقہ کے ان گنت غریب چھوٹے ممالک میں تشدد کی لرزہ خیز اور خون آشام فصلیں کاٹی جا رہی ہیں۔ آپ کن کن ممالک کا نام لیں گے۔ برونڈی ہو کہ زائیر، تنزانیہ ہو کہ روانڈہ یا صومالیہ۔ تمام افریقہ پر تشدد کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔

جنوب میں فلپائن سے لے کر انڈونیشیا، لاؤس، تھائی لینڈ اور برما اور پھر اپنے ہمسایہ ممالک میں سری لنکا اور افغانستان۔ کہاں کہاں کیا کچھ نہیں ہو رہا۔ ہر قسم کے مہلک ہتھیار استعمال ہو رہے ہیں اور ایک ہی ملک کے باشندے ایک دوسرے کا گلا بے دردی سے کاٹنے میں مصروف ہیں۔ سری لنکا ہی کی مثال لے لیجیے۔ پچھلے بارہ سال میں پچاس ہزار سے زیادہ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ اس ملک کی شرح خواندگی بھی تقریباً سو فیصد ہے۔ ادھر بوسنیا میں لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام محض نسلی اور مذہبی امتیازات کی خاطر روا رکھا گیا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے جنوب مشرقی علاقوں میں جو پڑھے لکھے خطے شمار ہوتے ہیں، وہیں نسلی اور لسانی تشدد کا بہت زور ہے۔ مرہٹوں اور گجرات کے علاقوں کے علاوہ مدراس تک یہ وبا پھیلی ہوئی ہے۔

پاکستان میں کراچی کا شہر قومی سطح پر ہماری ترقی اور خوشحالی کا مظہر ہے۔ ہمیں اپنے اس شہر پر بجا طور پر فخر بھی رہا ہے۔ یہاں شرح خواندگی اور تعلیم کا معیار دوسرے علاقوں کی نسبت کہیں بہتر ہے۔ لیکن پچھلے کئی سالوں سے درجنوں لوگ اس شہر میں محض لسانی اور نسلی تعصب کی وجہ سے ذبح کیے جاتے ہیں۔ پچھلے دس سالوں میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ قتل ہو چکے ہیں اور ابھی تک ہو رہے ہیں۔

کہا تو عموماً یہی جاتا ہے کہ جمہوری معاشروں میں رواداری، فراخ دلی، حوصلہ مندی اور صلح جوئی جیسے جذبوں اور رویوں کا پرورش پانا اور مستحکم ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ لیکن مغربی تہذیب اور مغربی تمدن کے علمبردار اور جمہوری اقدار کے نام پر عالمگیر قیادت اور راہبری کرنے والے ممالک میں سب سے زیادہ پیش پیش جو ملک عظیم ہے وہ تو یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ ہی ہے۔ وہاں کالی چمڑی پر امریکہ کی اکثر ریاستوں میں جو ظالمانہ اور متشددانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے اس کی مثال تو جنوبی افریقہ میں بھی تلاش کرنا ممکن نہیں۔ امریکہ وہ ملک ہے جسے ہم مغربی تہذیب کی آزاد، خودمختار اور جمہوری پیداوار کا نام دیتے ہیں۔ جہاں لوگوں نے از خود برطانیہ کی غلامی سے آزادی حاصل کی اور انسانی ضمیر کی آزادی اور انسانی مساوات کے نام پر ایک جمہوری اور غیر متعصب سیکولر نظام حکومت کی بنیاد ڈالی۔ ریڈ انڈین اور افریقی نسل کے حبشیوں کے ساتھ سلوک کو اگر آپ ایک طرف بھی رکھ دیں تو دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر اس جمہوری تہذیب کے علمبردار نے جس طرح جنگی مقاصد حاصل کرنے کے لیے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر، چند لمحوں میں لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اس طرز عمل کو آپ سنگین تشدد اور بدترین ظلم وستم کے سوا اور کیا نام دے سکتے ہیں۔ انسانی آبادی کو یکسر دو شہروں میں صفحہ ہستی سے مٹا دینا اور نیست و نابود کر دینا اس حکمت عملی کے لیے کس نظام اخلاق اور کس فلسفے سے آپ کوئی بھی تسلی بخش جواز ڈھونڈیں گے اور اگر کوئی دلیل یا جواز اس اقدار کے حق میں پیش بھی کیا جاتا ہے تو پھر انفرادی تشدد ہو کہ اجتماعی، انسان اپنے ضمیر کو تسکین دینے کے لیے شعوری اور لاشعوری طور پر کیا کچھ حیلے بہانے تلاش نہیں کر سکتا۔

یہ تمام مسائل اب انسانی معاشرے کو اس بات کی طرف متوجہ کر رہے ہیں کہ ہمیں ٹھنڈے دل اور پرسکون دماغ سے ''تشدد'' کے نفسیاتی، سماجی اور تاریخی مطالعے کی

طرف دھیان دینا پڑے گا اور اس کے شعوری اور لاشعوری عوامل اور عناصر کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ پاکستان کو وجود میں آئے اب پچاس سال ہو رہے ہیں۔ یہ کوئی تھوڑا عرصہ نہیں۔ وہ قوم جس کی جڑیں ہزاروں سال پرانی تہذیب میں پیوست ہیں اور جس نے اس زعم میں اپنی آزادی حاصل کی تھی کہ ہمارے پاس ایک مکمل ضابطہ حیات اور لائحہ عمل موجود ہے۔ وہ قوم اس سال (۱۹۹۷ء) میں اپنی پچاس سالہ جوبلی کی تقریبات اور جشن منانے کا خوب جوش و خروش سے اہتمام کر رہی ہے۔ اس موقع پر بہت کچھ لکھا جائے گا، بہت کچھ سوچا جائے گا۔ قومی زندگی کا محاسبہ اس سال ہمارے سامنے مختلف رنگوں میں پیش کیا جائے گا۔ ہم اپنی پچاس سالہ تاریخ کے مختلف پہلو طرح طرح کے ادوار اور اطوار کی شکل میں پیش کریں گے جو قابل فخر بھی ہوں گے اور قابل ستائش بھی اور کہیں نقد و نظر کے رنگ میں تنقید بھی ہوگی اور شاید تنقیص بھی۔ یہ سب کچھ ضرور ہونا بھی چاہئے۔ محاسبے کے لیے حوصلہ مندی ضروری ہے۔ اس لیے اس امر پر بھی غور ہونا چاہئے کہ ہمارے معاشرے میں پچھلے سالوں سے ''تشدد'' نے جو رخ اختیار کیا ہے وہ آخر ہمیں کس سمت میں لے جائے گا۔ ہم بحیثیت قوم اس طرح کے خوفناک تشدد کی روایتوں کو کہاں تک اپنی شخصیت کا حصہ بنا کر سلامتی اور عافیت کے دن گزار سکتے ہیں۔ ہم جو ہر سمت ''تشدد'' کے بیج بو رہے ہیں، کیا ان کی خوفناک فصلیں ہماری آنے والی نسلیں کاٹ کر جینے کے قابل بھی رہ سکیں گی؟ کیا ہماری غلط کاریوں کی وجہ سے ان کی زندگیاں عذاب نہیں بن جائیں گی۔ ابھی سے ہمارے معاشرے کا کیا حال ہو رہا ہے۔ ہمارے اعصاب مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ انفرادی تشدد سے لے کر لسانی، مذہبی اور علاقائی تعصب اور نفرت کا جس رنگ میں ہم اپنی سماجی اور گروہی زندگی اور روز مرہ کے معمولات میں اظہار کر رہے ہیں اور جن نتائج سے دو چار ہیں، کیا یہ سب کچھ اتنا کافی نہیں کہ ہم سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ ہماری قومی زندگی میں تشدد کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک مربوط حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ یہ حکمت عملی باقاعدہ سوچ بچار کے بغیر تو معرض وجود میں آنے سے رہی۔ اس کے لیے ہمیں سنجیدگی سے کئی سطحوں پر غور و فکر کرنا پڑے گا۔ فکری اور جذباتی سطح پر، قومی اور سیاسی سطح پر ہمیں ایسے ادارے تشکیل دینے پڑیں گے جو اس سلسلہ میں باقاعدہ کام کر کے کچھ ایسے نظریات اور کچھ ایسے تصورات پیش کریں جن پر عمل کر کے ہم زندگی کے اگلے پچاس سال کسی اور نہج پر گزار سکیں۔ ہم مشرقی پاکستان کے المیے

سے سبق سیکھ لیں۔ ہم کراچی کی قیامت پر قابو پا سکیں۔ ہم افغانستان کی بربادی اور تباہی کا مقدور بھر بحیثیت قوم کچھ تو ازالہ اور مداوا کر سکیں۔ ان تجربات سے کچھ سیکھ کر بہتر مستقبل کی تعمیر کے منصوبے بنا سکیں۔ یہ سب کچھ اسی طرح ممکن ہوگا جب سوچنے کے لیے ہمارے پاس ہمت اور حوصلہ ہوگا اور ٹھوس شواہد کی بنا پر قابل عمل حکمت عملی۔ یہ سب تبھی ممکن ہے کہ ہم موجودہ صورت حال کا صحیح طور پر جائزہ لے سکیں۔اس کتاب کے حوالے سے علمی سطح پر کوشش تو یہی ہوگی کہ ہم ''تشدد'' کے بارے میں آپ کے سامنے ایک ایسا مطالعہ پیش کریں جو متوازن ہو اور حقائق پر مبنی ہو۔ تشدد کے اجزائے ترکیبی خاصے پیچیدہ ہیں۔ ان میں شعوری اور لاشعوری جذبوں اور محرکات کا عمل دخل ہونا لازمی امر ہے۔ تشدد کے منفی رویے کیا ہیں۔ تشدد میں کیا کوئی مثبت پہلو بھی پوشیدہ ہوسکتا ہے۔ تشدد کو تربیت اور تعلیم کے بہانے کہاں تک استعمال کیا جاتا ہے اور کامیابی کی کیا شرح ہے۔ تشدد کے سلسلے میں ایک طرف خوف، ڈر، اضطراب، ہیجان، تشویش اور غم و اندوہ اور دکھ درد کے جذبات رونما ہوتے ہیں تو دوسری طرف جذبہ اظہار کے زور پر اشتعال، غصہ، نفرت، بغاوت، غیرت، انتقام اور تباہ کاری اور شکست و ریخت کا عمل برپا کرنا اپنی قوت، ہمت اور توانائی کا دوسروں پر سکہ جمانا۔ یہ تمام عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ پھر ایک طرف خفت، شکست، درماندگی کا احساس تو دوسری طرف غلبہ اور فتح و کامرانی کی سرشاری کے جذبات۔ یہ سب نفسیاتی اور اخلاقی عناصر ہیں جن سے افراد کی زندگیاں اثر انداز ہوتی ہیں اور معاشرے کی تہذیبی اور تمدنی روایتیں نشوونما پاتی ہیں اور ہماری ثقافتی اقدار، اچھی بری جو کچھ بھی ہوں، پروان چڑھتی ہیں۔ اسی طرح انسانی تاریخ کے حوالے سے بھی تشدد کی نفسیات اور اس کے عوامل کو سمجھنا ضروری ہے۔ تاریخ اندھا دھند تو اپنے آپ کو دہراتی نہیں۔ اس میں ایک ارتقائی عمل باقاعدہ جاری ہوتا ہے۔ لیکن تاریخ کا مطالعہ ہمیں وہ وسائل ضرور مہیا کرتا ہے جو عموماً ہماری حال کی نظر سے کسی حد تک پوشیدہ اور مخفی ہوتے ہیں۔ تاریخ ہمارے لیے ایک ''دریافت کا عمل'' ہوتا ہے جس سے ہم اپنے ماضی کے خزینوں سے بہت کچھ حاصل کر کے حال اور مستقبل کو بہتر طور پر استوار کر سکتے ہیں۔

جدید نفسیات ہمیں تشدد کا انفرادی سطح پر مطالعہ کرنے میں مدد پہنچائے گی۔ اسی طرح تاریخ اور عمرانیات اور کسی حد تک علم الانسان ہمیں تشدد کے سماجی اور اجتماعی عوامل کا

شعور حاصل کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوں گے۔ کیونکہ تشدد کی انفرادی شکل کے علاوہ اس کی ہیبت ناک جلوہ گری تو اب نسلی، علاقائی اور قومی تشدد کی صورت میں ہونے لگی ہے اور یہ سلسلہ اس قدر مہلک اور خطرناک ہوتا جا رہا ہے کہ اب انسان کا اجتماعی شعور یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ اس قیامت خیز وبا پر کیسے قابو پایا جا سکے گا۔ انسانی زندگی کی بقا کے لیے اب یہ ضروری ہے کہ ہم بیدار مغزی سے تشدد کے عوامل پر غور کریں۔

محض طاقت اور جبر کے زور پر اپنے مفادات کے حصول کی روش جدید انسان کو بحالت مجبوری چھوڑنا پڑے گی۔ کیونکہ طاقت اور تشدد کا استعمال اتنا ''مقبول عام'' ہو گیا ہے کہ اب یہ ''خواص'' کی اجارہ داری نہیں رہا۔ اگر تشدد کا رنگ جارحانہ رہے گا تو اس کے جواب میں اس کی ایک شکل مدافعانہ اور دفاعی بھی اتنی ہی شدت کے ساتھ موجود رہے گی۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے ''جوڑے'' میں جن سے چھٹکارا حاصل کرنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ''تشدد محض'' سے نجات حاصل کی جائے۔ نہیں تو تشدد کا جواب تشدد سے ضرور ملتا رہے گا اور تشدد کرنے والا تشدد سہنے والا کا نشانہ بھی ضرور بنے گا۔ دیر ہو یا سویر گالی کا جواب گالی سے اور گولی کا جواب گولی سے ضرور ملے گا۔ جب تک ہم ایسا معاشرہ تشکیل نہ دیں جس کی اقدار کی سمت ہی کچھ اور ہو اور انسانی زندگی کی تخلیقی قوتوں کے ذریعہ اظہار کا پیش منظر ہی بدل دیا جائے۔ یہ باتیں تو بہت دور کی ہیں جن کی طرف اس کتاب کے آخر میں شاید کچھ اشارات بھی پیش کیے جا سکیں۔ لیکن اس مطالعے کا اصل مقصد تو محض یہ ہے کہ ہم تشدد کا ایک ایسا جائزہ پیش کر سکیں جو تشدد کی دو دھاری تلوار کی تباہ کاری آپ کے سامنے پیش کر سکے۔ طاقتور طبقے تشدد کو اپنے زور بازو سے استعمال کر کے اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں اور دوسری طرف ناتواں، مفلس طبقات مزاحمت اور مدافعت کے ہاتھوں بے بسی کے عالم میں مانگے تانگے کے ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اسی طرح تشدد کی یہ تجارت کھلے بندوں ''کھلی منڈی'' میں عالم گیر ''انسانی گاؤں'' میں جاری و ساری ہے۔ کرہ ارض سمٹ کر تشدد کے آہنی پنجوں میں اس طرح جکڑا ہوا نظر آ رہا ہے کہ ایک ''محور'' کے گرد چکر لگاتے لگاتے اس کا سانس رکنے لگا ہے۔

دیکھئے نفسیات تو ہمیں یہ سبق بھی سکھاتی ہے کہ تشدد صرف ایک فرد دوسرے فرد پر نہیں کرتا۔ اذیت کوشی اور اذیت طلبی کے کئی نفسیاتی پہلو ہیں۔ بعض افراد اور بعض

معاشرے ذہنی اور جذباتی طور پر اتنے بیمار ہو جاتے ہیں کہ وہ ''اذیت طلب'' بن کر جی رہے ہوتے ہیں۔ وہ لاشعوری طور پر اذیت اور تشدد برداشت کرنا اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ انسان تشدد صرف دوسرے انسان پر ہی نہیں کرتا بعض اوقات وہ اپنے تشدد کا نشانہ خود اپنی ذات کو بنالیتا ہے۔ وہ شخص جو اپنے آپ کو حالات کے زیراثر ''خودکشی'' یا ''خودسوزی'' کی سطح پر لے آتا ہے تو وہ درحقیقت ایک تشدد سے رہائی پانے کے لیے مدافعانہ رنگ میں اپنے آپ پر تشدد کو نہ صرف جائز سمجھتا ہے بلکہ ضروری گردان کر اس کے سامنے اپنی گردن جھکا دیتا ہے۔ وہ تشدد سے نجات پانے کے لیے تشدد کو بروئے کار لا رہاہوتا ہے۔ خود کو تباہ کرنا انسان کے خواص میں شامل ہے۔ تو پھر ہمیں سوچنا پڑے گا کہ اس دور میں عالمگیر سطح پر تشدد کا جو خوں ریز سیلاب آیا ہوا ہے کیا یہ ایک سطح پر انسان اپنے ہاتھوں سے اپنے معاشرے اور اپنی زندگی کو خودکشی کی طرف تو نہیں دھکیل رہا۔ یہ ''لاحاصلی'' اور ''بے معنویت'' کے لوازم میں تو شامل نہیں کہ جب انسانی رشتوں کی اساس محض زندگی کے دن پورے کرنے ہوں تو پھر ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے کہ آدمی خود ان دنوں کی مالا کے دانے گنتے گنتے اپنے ہاتھوں سے ہی زندگی کی مالا کو مسل دیتا ہے۔ ''انسانی زندگی کو ہونا بھی چاہئے یا نہیں؟ دراصل سوال تو یہی ہے۔'' اور جب زندگی بے مقصد اور بے معنی نظر آئے اور جب مادی اقدار معاشرے کی اخلاقی اور روحانی اقدار کے ساتھ تمام روابط منقطع کر لیں تو تشدد کی شکل انفرادی ہو کہ اجتماعی ہر دو صورتوں میں تباہ کن ہی ثابت ہو گی۔

انسانی نفسیات میں ''تشدد'' کا مطالعہ باقاعدہ ایک علیحدہ علمی مکتبے یا مدرسہ فکر کی صورت میں تو ابھی تک ہوا نہیں لیکن سماجی نفسیات اور امراضی نفسیات اور اسی طرح بچوں کی پرورش سے متعلق بعض نفسیاتی مدرسہ ہائے فکر میں تشدد، جبر، اشتعال انگیزی اور جرائم کے سلسلے میں ایسے مطالعے ضرور ہیں جن سے ہم اس کتاب میں ضرور مدد لیں گے۔ تاکہ تشدد کے بارے میں ہماری معلومات زیادہ وقیع ہو سکیں۔ تحلیل نفسی والوں کے ہاں انسانی نفس کے مبادیات کے بارے میں جو مفید اطلاعات ہیں ان سے بھی ضرور فائدہ اٹھایا جائے گا۔ اس کے ساتھ دوسرے معاشرتی علوم یعنی سوشیالوجی اور علم الانسان کے شعبوں سے بھی کسی حد تک رہنمائی حاصل کریں گے۔ انسان کی ابتدائی زندگی جو جنگلوں اور غاروں میں بسر ہوئی اس میں بھی تشدد کے عوامل پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح تمدن اور تہذیب کے جو

مختلف ادوار انسان کی اجتماعی زندگی میں آئے اس کی تاریخ، ادب، ثقافت اور دیو مالا سے بھی استفادہ کرنا ضروری ہوگا تاکہ انسان کے اجتماعی شعور اور لاشعور کے عوامل سے بھی ہم شناسا ہوسکیں۔ بہرحال ہماری یہ علمی کاوش بے شک ابتدائی نوعیت کی ہے اور ہمیں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ ہم خاطر خواہ علمی وسائل کو اس طرح جمع کر سکیں کہ ''تشدد'' کے موضوع پر کوئی مبسوط علمی مطالعہ آپ کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہوسکیں۔ لیکن اتنا اعتماد اور بھروسہ ہمیں ضرور ہے کہ یہ عاجزانہ کوشش محض سعی رائیگاں نہیں ہوگی۔ بہت سے پہلو اس کتاب میں ایسے ضرور دیکھیں گے جس سے اس موضوع پر ایک مفید بحث کا آغاز ہوگا۔ ''گر قبول افتدز ہے عزو شرف!''

غالب احمد

۲۷ فروری، ۱۹۹۷ء

تشدد اور جدید نفسیات

جس طرح سقراط، افلاطون اور ارسطو کا زمانہ یونانی تاریخ میں ہی نہیں بلکہ یورپ اور پھر تمام دنیا کی تاریخ اور فلسفے میں نہایت اہم دور قرار پاتا ہے، اسی طرح ہم پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں صدی علوم جدیدہ کی ترقی اور نشوونما میں حیرت انگیز طور پر انسانی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس صدی میں طبعی علوم کے علاوہ معاشرتی علوم نے بھی تاریخ ساز رفعتیں حاصل کیں۔ ڈارون، فرائڈ، کارل مارکس، نیٹشے، آئن سٹائن اور اقبال نے اپنے اپنے علمی میدانوں میں نئے افق اور نئے مدار دریافت کیے اور نئے نظریات کو تحقیق اور مشاہدے کی روشنی میں پرکھنے کی جرات عطا کی۔

جدید نفسیات نے انسانی رویوں کے معاملے میں تجربے، مشاہدے اور تجزیے کے استعمال کو لازمی قرار دیا۔ سائنسی رویے کی کسوٹی پر انسانی نفس کے عوامل کو جانچنے اور پرکھنے کے اصول مرتب کیے۔ نفسیات نے ہمیں یہ سبق دیا کہ ہم دشمنی، محبت، نفرت، خوف، دہشت، رقابت، رفاقت، ہمدردی، ظلم، ندامت، پشیمانی اور ملامت جیسے جذبوں اور رویوں کے بارے میں جب علم اور سائنس کی سطح پر بات کریں تو ہمارے سامنے ایک ایسی کسوٹی ہونی چاہئے کہ ان جذبوں کے مبادیات اور جزویات کا تجزیہ کرتے ہوئے نفسیات کے اصول یکساں طور پر چسپاں کیے جاسکیں اور ہمیں علمی سطح پر یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ان جذبوں کی افراط اور تفریط سے انسانی عمل اور انسانی شخصیت اور نفس پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کس جذبے کی کس نوعیت کو اور کس خاصیت کو آپ ایک عام صحت مند فرد کے ساتھ منسوب کرتے ہیں اور وہی جذبہ اگر ایک خاص حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو آپ اس کو ''غیر معمولی'' قرار دیں گے یا غیر صحت مندانہ گردانیں گے؟ معاشرے میں صحت مند فرد کا طرزِ عمل کیا ہوگا اور مریض یا مریضانہ ذہنیت رکھنے والا شخص کس طرح کا ردِ عمل دکھائے گا؟

اب یہاں ''تشدد'' کے مسئلے کو ہی آپ پیش نظر رکھ لیں۔ پہلے تو ''تشدد'' کی آپ کو کوئی ''تعریف'' تجویز کرنا پڑے گی۔ ہم کسے تشدد کہتے ہیں؟ آیا تشدد کسی ایسے عملی اظہار کا دوسرا نام ہے جس سے تشدد کرنے والا شخص اپنے عمل سے غیر معمولی طور پر کسی دوسرے فرد یا افراد کو ''اذیت'' ذہنی ہو یا جسمانی یا اخلاقی اور روحانی یا پھر وہ مادی سطح پر کوئی نقصان پہنچانے والی کیفیت ہو۔ تشدد کے زمرے میں ہر وہ طرز عمل یا طرز سخن آ جائے گا جس سے دوسرے افراد یا ایک واحد شخص معروضی سطح پر اپنے آپ کو معمول سے زیادہ اذیت یا دکھ اور درد کی کیفیت میں مبتلا محسوس کرتا ہے۔ وہ چاہے محض سخت کلامی یا بدکلامی ہی ہو یا کوئی ایسا فعل جس سے انسانی نفس کو ایسی ٹھیس لگے جس سے اس کی عزت نفس مجروح ہوئی ہو۔ چاہے وہ ٹھیس ذہنی ہو یا جذباتی یا جسمانی اور مادی۔ آپ اسے جب ایسی اذیت میں مبتلا کرتے ہیں جو معمولات زندگی سے ہٹ کر ہے تو آپ کا رویہ متشددانہ ہو جاتا ہے اور جب اس میں ایسی شدت یا شدید رنگ پیدا ہو جاتا ہے جس سے دوسرا انسان اپنے آپ کو کسی حد تک مجروح سمجھتا ہے اور اپنے لیے نقصان دہ قرار دیتا ہے تو عرف عام میں اس فعل کو تشدد ہی قرار دیا جائے گا۔ یہ تو ایک روز مرہ کا استعمال ہو گیا کہ ہم ہر اس حرکت یا فعل کو تشدد کے زمرے میں شامل کریں گے جس نے دوسرے انسان یا فرد پر اس طرح نفسیاتی اعتبار سے اثر کیا ہے کہ وہ غیر معمولی ہیجان یا اذیت یا تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ یا اس پر خوف اور غم کی کیفیت طاری ہو گئی اور یا اس کے بالکل برعکس وہ بھی طیش، اشتعال اور غصے کے جذبے سے دو چار ہو گیا۔ ایسا فعل ''تشدد'' ہی کہلائے گا۔ لیکن اس تعریف کو ہم بہرحال اس وقت تک جامع قرار نہیں دے سکتے جب تک ہم نفسیات کے مروجہ اصولوں اور نظریوں کو ''تشدد'' کے اجزائے ترکیبی کے تجزیئے کے لیے خاطر خواہ حد تک استعمال کر کے نہ دیکھ لیں۔

تشدد بھی ایک بنیادی انسانی رویہ ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے انسانی تاریخ کا اور انسانی نفسیات کا ہمیں اس رنگ میں مطالعہ کرنا ہو گا کہ ہم معاشرے کی ابتدائی تشکیل کے ساتھ تشدد کے اجزائے ترکیبی کا بھی جائزہ لے سکیں اور ان اسباب کا بھی بغور مطالعہ کر سکیں جن سے انسانی معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر ''تشدد'' کی پرورش اور نشوونما ہوئی اور کس طرح یہ ارتقا کی منازل طے کرتے ہوئے موجودہ دور تک آ پہنچا ہے کہ اب یوں دیکھائی دیتا ہے کہ تشدد کے سیلاب کے سامنے بند باندھنا بہت ہی کٹھن ہو گیا ہے۔ یوں لگتا

ہے کہ ہم کس بنیادی جبلت مرگ کے نرغے میں آن پھنسے ہیں اور ہمیں بھاگنے کا کوئی رستہ دکھائی نہیں دے رہا!

تشدد کے تین روپ:

تشدد کے بارے میں بعض نفسیاتی نظریات کے ذکر سے پہلے یہ ضروری ہوگا کہ ہم قدیم انسانی تاریخ اور علم الانسان کے حوالے سے تشدد کے بارے میں آپ کے سامنے ایک ایسا منظر پیش کریں جس سے ابتدائی انسانی دور میں ''تشدد'' سے انسان کی آشنائی اور روشناسی کا ایک مبہم سا لیکن کسی حد تک مفید سا خاکہ ہمارے سامنے موجود ہو، جس کی بنا پر علمی سطح پر بات کو آگے بڑھایا جا سکے۔ انسانی معاشرے نے جب غاروں اور جنگلوں کی معاشرت کا آغاز کیا تو اس کے بارے میں یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ انسانی زندگی کا آغاز نیم جانورانہ دور میں بہتے پانیوں میں ہوا یا دلدلوں میں یا جنگلوں میں؟ بہرحال جسے ہم نیم انسان یا نیم بشر کہہ سکتے ہیں وہ کسی حد تک جنگلوں میں زندگی بسر کرتا تھا۔ یا پھر جنگلوں سے بھاگ کر اس نے غاروں اور ٹیلوں پر سکونت اختیار کی۔ اس کے بارے میں کئی آراء ہیں۔ لیکن اس بات پر سب کو اتفاق ہے کہ جنگلوں کی زندگی کے دوران انسان نے غیر معمولی قدرت کے مظاہر کو دیکھ کر ''تشدد'' کا پہلا ''روپ'' دیکھا۔ موسمی آفات کا ایک دم نازل ہونا۔ شدید بارش، شدید طوفان، شدید زلزلہ، شدید وبائی امراض کا ظہور پذیر ہونا۔ یہ قدرت کے تشدد کے ایسے مناظر تھے جن کی شدت، اذیت اور ایک دم نازل ہونے کی کیفیت سے جب نیم انسان دو چار ہوتا تھا تو اس کو محسوس ہوتا تھا کہ اس پر غیر معمولی حالات کے باعث قدرت کی طرف سے ''تشدد'' کی کیفیات کا اظہار ہو رہا ہے۔ پھر اسی طرح جنگلی جانوروں کا اچانک حملہ۔ شیر کا چیرنا، پھاڑنا۔ سانپ کا ڈسنا۔ عقاب کا جھپٹنا۔ کوئی بھی اچانک حملہ یا اذیت ناک حادثہ تشدد کی ماہیت کو انسانی نفسیات پر اجاگر کرتا جاتا ہے۔ انسان میں ''نقل'' کا عمل ایک فطری طور پر علم اور تربیت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ جانور ہو کہ انسانی بچہ سب نقل کے عمل سے گزر کر عقل کا استعمال سیکھتے ہیں تو وہ اعمال کو نقل (Immitation) کے ذریعے سے اپنے وراثت کا حصہ بناتے ہیں۔ یہی نقل کا عمل انسان کی ابتدائی حیواناتی زندگی کا بھی ایک اہم حصہ رہا ہے۔ انسان نے قدرت کے مظاہر سے ''تشدد'' کی قوت اور ہیبت

کا سبق سیکھا ہے۔ مثلاً جب زلزلہ اچانک آتا ہے تو اس کی دہشت کا باعث ایک تو اس کا ناگاہ اور غیر متوقع طور پر فوراً آنا ہے جسے ہم ناگاہی کا عنصر (Element of Surprise) کہہ سکتے ہیں، دوسرے عناصر اس کی ہیبت ناکی، اس کی دہشت اور تباہی و بربادی ہیں۔ جس طرح وہ تمام علاقے کو لرزہ براندام کر دیتا ہے، اس میں دہشت گردی اور تشدد کے تمام عناصر موجود ہوتے ہیں اور وحشت کا وہ انداز ہوتا ہے جو جنگل کی فضا کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے باوجود اپنی منفرد پہچان رکھتا ہے۔ اسی طرح شدید طوفان بادو باراں، یا دریاؤں اور سمندروں کا ابل پڑنا یہ سب قدرت کی طرف سے زمین پر رہنے والے باسیوں کے لیے ایک طرح سے تشدد کی واردات شمار کی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح انسان اور اس کا معاشرہ بہت ابتدائی دور سے طبعی عناصر کی اچانک کارفرمائیوں سے ''تشدد'' کی عقلی اور فہمی پہچان کے علاوہ اس سے وابستہ جذباتی ردعمل سے رفتہ رفتہ شناسا اور مانوس ہوتا گیا اور اس کی اہمیت کا احساس اس کے شعور اور لاشعور میں جاگزیں ہونے لگا۔ طوفان، ژالہ باری، بجلی کی کڑک اور چمک اور اس کا زمین پر گرنا اور درختوں اور دیگر اشیاء کو بھسم کر دینا یہ سب ایسے مناظر تھے جس نے اسے اپنے دشمنوں اور رقیبوں کے لیے استعمال میں لانے کے لیے اکسایا۔ تشدد اور دہشت کے لیے جو ڈرامائی عناصر یہ قدرتی مناظر پیش کرتے تھے، اس نے انہی عناصر کو بروئے کار لا کر، یعنی اچانک حملہ آور ہونا۔ چھپ کر وار کرنا۔ دہشت کے لیے خوفناک چیخ و پکار کا اہتمام کرنا تاکہ مدمقابل کے اعصاب جواب دے جائیں اور پھر اذیت ناک حد تک اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جو واردات بھی پیش نظر ہو اسے بروئے کار لانا، یہ سب دہشت اور تشدد کے لیے ضروری امور سمجھے گئے۔

اس طرح جنگل کے نیم انسان نے دوسرے جانوروں اور پھر ارد گرد کے قبیلوں پر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تشدد کو ضروری سمجھا۔ اپنے شکار پر اچانک تندی اور تیزی سے جھپٹنا، اس پر غلبہ پا کر اسے زیر کرنا، یہ سب کچھ تشدد کا ارتقائی منظر نامہ تھا۔ یہ ''شکار'' کا فلسفہ تھا۔ اسی طرح انسان بھی شکار ہوتا تھا اور کبھی شکار کرتا تھا۔ ایک انسان کے ہاتھوں دوسرا انسان اور ایک جانور کے ہاتھوں دوسرا جانور۔ اس تاریخی ارتقا کے مطابق چھوٹے چھوٹے قبیلے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے تاکہ ان کے ساز و سامان اور خورد و نوش کی اشیا پر قبضہ کر سکیں اور فائدہ اٹھا سکیں۔ اسی جارحانہ عمل کے قدرتی نتیجہ میں تشدد کے خلاف

مزاحمت کے رنگ میں تشدد کا وجود رونما ہوا۔ تشدد کے خلاف تشدد کے ہتھیار سے ہی اپنی مدافعت کے اصول انسانی شعور اور لاشعور نے حاصل کیے اور ان کے اثرات اس کی اجتماعی یادداشت میں یادوں اور اساطیر کے رنگ میں اثر انداز ہونے لگے۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ تشدد کا دفاع لازمی طور پر جوابی تشدد سے ہی ہوسکتا ہے، جب تک آپ حملہ آور پر جوابی وار کر کے اسے روکیں گے نہیں تو وہ شخص یا جانور یا گروہ آپ کا پیچھا چھوڑے گا نہیں۔ ہاں جب اس کو یہ احساس ہوگا اور وہ یہ بھانپ لے گا کہ تشدد کے مقابلے میں اسی قدر تشدد کا سامنا ہے اور اس کی بقا کو خطرہ ہے تو پھر وہ پسپائی اختیار کرے گا۔ اس فرار کی حالت میں اب یہ آپ کی چھٹی حس طے کرے گی کہ آپ اس کا پیچھا کر کے اسے تباہ و برباد کر دیں یا اسے جانے دیں کیونکہ آپ میں بھی اتنی سکت اور ہمت نہیں کہ اسے فرار کی حالت میں جا کر دبوچ لیں۔

یہ مدافعتی تشدد تاریخ کے پس منظر میں اب انسانی معاشرے میں ایک جانا پہچانا اور اخلاقی سطح پر مانا ہوا اصول ہے۔ نہ صرف آپ اپنی زندگی کا دفاع تشدد کے جواب میں اسی قدر تشدد کو بروئے کار لاتے ہوئے کر سکتے ہیں بلکہ ایک حد تک بعض حالات میں مقامی اور بین الاقوامی قوانین اس کی اجازت بھی دیتے ہیں کہ آپ جارحیت کا قلع قمع کرنے کے لیے اپنے دشمن کا پیچھا بھی کر سکتے ہیں۔ اسے اس کے گھر تک جا کر سزا دے سکتے ہیں۔ آپ کا ''دشمن کا سرگرمی سے پیچھا کرنے کا حق'' یعنی (Right of Hot Pursuit) کا محاورہ اسی وجہ سے اپنایا گیا ہے۔

''تشدد'' کی تشکیل کی دو ابتدائی صورتیں آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ فطرت کے تشدد کے مناظر سے سیکھ کر تشدد کو بروئے کار لانا اور اچانک حملہ آور ہونا کسی کو سبق سکھانے کے لیے یا دہشت پیدا کرنے کے لیے یا اس کے مال و متاع یا جان و مال لوٹنے کے لیے۔ یہ ''شکار'' کا روپ تھا جو انسان کو اپنی ارتقا اور بقا کے لیے اختیار کرنا پڑا۔ اس کے مقابل میں تشدد کا دوسرا ''روپ'' تشدد کے جواب میں دفاعی تشدد کی شکل میں ظاہر ہوا۔ تشدد کا تیسرا روپ بھی ابتدائی انسانی معاشرے میں قبائل کے مروجہ اصولوں یا طریقوں سے انحراف کے باعث ''سزا'' کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ''جرم'' کا احساس اور اس کے بدلے میں ''سزا'' یا جرم کا بدلا۔ یہ ایک ایسا روپ ہے جس نے تشدد کو اخلاقی سطح پر جائز قرار دینے

کے راستے ہموار کیے۔ انسانی جبلت میں کہیں اس تصور اور اس عمل کی اور اس کے ردعمل کی ایسی گنجائش یا جگہ ضرور تھی جس کی مثبت شکل ارتقائی عمل کے ساتھ آہستہ آہستہ ترقی یافتہ انسانی معاشروں میں میں مستعمل ہوتی گئی۔ جرم و سزا کا مسئلہ قدیما ور جدید اخلاقیات اور اخلاقی فلسفوں میں روز اول سے ایک خاص اہمیت کا حاصل ہے۔ تشدد کے مثبت اور جائز استعمال کی کیا مقدار ہے؟ کہاں تک تشدد جائز ہے؟ یہ سب مسائل ابھی تک زیر بحث ہیں۔ آپ افراد یا کسی گروہ کو ان کا جرم ثابت ہونے پر سزا دے سکتے ہیں۔ جرم کی مقدار اور اہمیت کے مطابق سزا کی کیا مقدار اور نوعیت ہوگی؟ اگر یہ توازن قائم نہ رہے تو ''سزا'' پھر ایک تشدد کی صورت اختیار کر جائے گی۔ یہ تمام مسائل اب بھی جدید معاشروں میں کئی سطحوں پر زیر بحث آتے رہے ہیں۔''سزا'' کی شکل میں تشدد کی ایسی صورتیں سامنے آتی ہیں کہ جرم و سزا سے ماورائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جرم کی سمت کچھ اور ہوتی ہے اور سزا کسی اور جانب رخ اختیار کر جاتی ہے۔ یا جرم کرتا کوئی اور ہے بدلہ لینے کے لیے سزا کسی اور کو دی جاتی ہے۔ کیونکہ مجرم ہاتھ نہیں لگ رہا۔''کرے کوئی اور بھرے کوئی'' اس قسم کے حالات ہر قدیم اور جدید معاشرے میں پیش آتے رہتے ہیں۔ جب''سزا'' جائز حدود سے تجاوز کر جاتی ہے تو پھر وہ تشدد یا ظلم کے زمرے میں آ جاتی ہے اور ہمارے اس مطالعے کے دائرہ کار میں آ جاتی ہے۔

''تشدد'' اور نفسیات کے چند بنیادی اصول:

اس ابتدائی تعارف کے بعد ہم تشدد کی یہ تعریف کر سکتے ہیں کہ انفرادی یا اجتماعی سطح پر کوئی ایسا غیر متوازن عمل یا حرکت جو کسی دوسرے فرد یا گروہ کو فکری، جذباتی یا جسمانی اضطراب، تشویش یا دکھ کی کیفیت میں مبتلا کر دے، وہ''تشدد'' کہلائے گا۔ شرط یہ ہے کہ اس تشدد کے فعل کو بروئے کار لانے والا کسی حد تک شعوری سطح پر ایک منصوبہ بندی کی صورت میں یہ عمل کر رہا ہے۔ محض حادثاتی نہیں۔ اس''تعریف'' کے مختلف اجزا کو سمجھنے کے لیے ہمیں جدید نفسیات کے کچھ اصولوں سے تعارف حاصل کرنا ہوگا کیونکہ شعوری کوشش اور لاشعوری فعل کی تمیز اور حادثاتی ردعمل کے عناصر ایسے نازک رشتوں سے وابستہ ہیں کہ ان کے تسلی بخش ادراک کے لیے چند بنیادی اصولوں سے آگاہی حاصل کرنا ہمارے لیے

ضروری ہو گا۔

انسانی عمل کے تین بنیادی عناصر:

(الف) پہلا بنیادی اصول تو انسانی عمل کا تجزیہ ہے۔ انسانی عمل کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ یا ٹکڑا بھی اپنے اندر ایک خاص اجزائے ترکیبی رکھتا ہے۔ اس کے تین بنیادی اجزاء ہوتے ہیں۔ پہلا جز یا عنصر آگاہی یا شعور کا ہوتا ہے۔ یعنی جب بھی ہم کوئی عمل کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہماری آگاہی یا شعور کا کوئی نہ کوئی عنصر ضرور موجود ہوتا ہے۔ جسے ہم نفسیات میں حسی شعور یا ذہنی آگاہی کہہ سکتے ہیں۔ انگریزی میں نفسیات کی ٹرم ''Cognition'' اس عنصر کے لیے مخصوص ہے۔ عمل کا عموماً پہلا عنصر یہ حسی آگاہی یا پہچان ہوتی ہے۔

(ب) عمل کا دوسرا عنصر حرکت یا فعلی ارتعاش ہوتا ہے، جسے ہم نفسیات میں عملی یا حرکی (Connation) کی انگریزی ٹرم سے پہچانتے ہیں۔ یہ کسی فعل کا انفعالی یا متحرک عنصر ہوتا ہے جس سے ہمارے نفس میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ عموماً ہر حسی شعور کے بعد حرکت یا انفعالی صورت ہمارے وجود میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہم پہلے کسی چیز سے آگاہ ہوتے ہیں پھر اس کے بارے میں ''حرکت'' کرتے ہیں۔ یہ حرکت چاہے کتنی خفیف یا لطیف ہو لیکن جسم میں حرکت یا ارتعاش پیدا ضرور کرتی ہے۔

(ج) عمل کا تیسرا عنصر یا جز اس کا تاثیراتی پہلو ہوتا ہے۔ یعنی کسی نہ کسی سطح وہ جذباتی تاثر ضرور پیدا کرتا ہے۔ کوئی عمل ہمیں اچھا لگے گا کوئی برا۔ کسی پر ہمیں خوشی ہوگی یا اطمینان اور آسودگی حاصل ہوگی اور کوئی عمل ہم میں غم وغصہ یا محض بے اعتنائی اور بے رغبتی پیدا کرے گا۔ جو بھی جذباتی ردعمل ہوگا اس کو ہم اس عمل کا تاثیراتی پہلو یا جز کہیں گے۔ اس کو نفسیات میں ''اثر یا تاثیر'' کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے ''Affection'' کی اصطلاح رائج ہے۔

اب اگر آپ تشدد کے عمل کا ہی مشاہدہ یا تجربہ کریں تو آپ کے ہر چھوٹے بڑے تشدد کے فعل یا عمل میں یہ تینوں عناصر موجود نظر آئیں گے۔ تشدد کرنے والا بھی ان کا حامل ہے اور جس پر تشدد کیا جاتا ہے وہ بھی ان تینوں عناصر سے دو چار ہوتا ہے۔ تشدد

کرنے والا شعوری سطح پر پہچان رکھتا ہے کہ وہ کہاں اور کس پر اور کس وقت تشدد کی واردات، اور کس وجہ سے کر رہا ہے۔ یہ حسی شعور کا حصہ ہوتا ہے اور Cognition کے زمرے میں آتا ہے۔ پھر وہ فعل جو تشدد پر مبنی ہوتا ہے وہ اس سے سرزد ہوتا ہے۔ یہ تشدد کی حرکت یا فعل کا حرکی عنصر ہے جسے ہم Connation کہتے ہیں اور آخر میں وہ تشدد کرنے کے بعد اس کی تاثیر اور اثر کے عمل سے جذباتی سطح پر گزر رہا ہوتا ہے۔ انتقام کا جذبہ ٹھنڈا ہوتا ہے غصہ فرو ہوتا ہے۔ یا اضطراب کی کیفیت میں اور زیادتی ہو جاتی ہے۔ یہ سب جذباتی کیفیت ہیں جن میں سے کسی ایک یا دو عناصر سے وہ اس وقت دو چار ہوتا ہے۔ اسی طرح جس پر تشدد کیا جاتا وہ حسی اعتبار سے پہلے تشدد کو ادراکی سطح پر ہوتا دیکھتا ہے۔ پھر اس پر تشدد کا عمل جاری ہوتا ہے اور پھر وہ تشدد کی تاثیر یا اثر سے جذباتی سطح پر دو چار ہوتا ہے۔ اذیت اور دکھ درد کی کیفیت سے گزرتا ہے۔ کسی بھی انسانی فعل میں، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، ان تینوں عناصر کا ہونا لازمی ہے۔ کبھی ''ادراک'' کا عنصر زیادہ ہوتا ہے اور کبھی حرکی اور عملی کیفیت زیادہ ہوتی ہے اور کبھی ادراک اور عمل دونوں سے زیادہ تاثیر اور اثر انداز ہونے کی کیفیت کا غلبہ ہوتا ہے۔ غم کی شدت یا خوشی اور راحت کا زور! ہر انسانی عمل میں ان تینوں عناصر کے موجود ہونے کی وجہ سے انسانی نفس کا تمام اعصابی نظام ''دل'' دماغ اور انسانی جسم کے دیگر اعضاء، عمل کی ان تینوں کیفیات سے زندگی کے ہر لمحہ میں اپنے اپنے دائرہ کار میں عمل پیرا رہتے ہیں اور اسی طرح بچپن سے لے کر بڑھاپے اور زندگی سے لے کر موت تک نفس انسانی ان تینوں کیفیات کے مختلف مجموعوں سے اپنی شعوری اور لاشعوری یادوں کا خزینہ تیار کر پاتا ہے، جس میں اس کی انفرادی زندگی کے علاوہ ارتقائی عمل کے سہارے پچھلے زمانوں اور پچھلے ادوار کے ترش و شیریں واقعات، حادثات اور تجربات بھی ایک وراثت کے بحر بے کراں کی صورت میں اس کے لاشعور میں ہر وقت شامل رہتے ہیں اور اس طرح تشدد کی یادوں کا ایک مجموعہ ہر فرد کی زندگی میں جمع ہوتا رہتا ہے اور لاشعوری طور پر اس کے خواب و خیال اور پوشیدہ تصورات کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہ خواب، خیال اور تصورات بھی تجزیہ طلب ہوتے ہیں۔ جب یہ اجتماعی انسانی شعور اور لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں، تو پھر یہ دیو مالا اور اساطیری علامتوں کی شکل میں افراد کے شعور اور لاشعور میں کسی نہ کسی طریقے سے اجاگر ہوتے رہتے ہیں اور ہماری زندگی کے جذباتی پہلوؤں پر طرح طرح سے اثر انداز ہوتے

ہیں۔ کبھی انفرادی اور اجتماعی خوابوں، خواہشوں، حسرتوں اور ناکامیوں کی شدید یادوں اور بازگزشتوں کی صورت میں اور کبھی ہماری گروہی، نسلی اور قومی امنگوں اور آرزوؤں کے انداز میں ہمارے تحت الشعور میں یہ محرکات اس طور سے اثر انداز ہوتے ہیں کہ ہماری سمجھ بوجھ سے بالا یہ ہماری اجتماعی زندگی کا شیرازہ یا تو منتشر کرنے کا باعث بن جاتے ہیں یا پھر اس میں ایسی شدت اور توانائی پیدا کر دیتے ہیں کہ پورا معاشرہ یک سوئی سے ایک نصب العین کے حصول کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ بلاخوف وخطر وقف کر دیتا ہے۔

''تشدد'' کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں نفسیات کے اس بنیادی اصول کو اپنے سامنے ہمیشہ رکھنا ہو گا کہ تشدد کی تین جزیات لازمی ہیں۔ ایک اس کا شعوری حصہ، دوسرا اس کا عملی یا حرکی رخ۔ یعنی یہ دیکھنا ہو گا کہ تشدد کا عمل اپنی نوعیت میں کس قسم کی حرکت یا عمل پر مبنی ہے۔ کیا وہ محض اخلاقی یا نفسیاتی سطح پر ہے؟ یا وہ بدنی یا جسمانی صورت میں روا رکھا جا رہا ہے؟ اور پھر اس کا تاثیری یا جذبات کی سطح پر اثر انداز ہونے والا پہلو کس نوعیت کا ہے؟ وہ کون سی جذباتی کیفیت پیدا کر رہا ہے۔ جسمانی اذیت اور دکھ کی شکل میں یا محض اخلاقی اور روحانی سطح پر اضطراب یا غم واندوہ کے جذبات پیدا کر رہا ہے۔ یا اس تشدد کے واقعہ نے انفرادی یا اجتماعی سطح پر ایک غیض وغضب کی کیفیت پیدا کر دی ہے اور اشتعال انگیز ہو کر وہ واقعہ انتقام اور بدلہ لینے کے جذبات کو ابھار رہا ہے۔

اس اعتبار سے اگر آپ انسانی عمل اور کردار کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کریں گے تو آپ ہر ایسی کیفیت کو جس میں معمول سے زیادہ ''شدت'' ہو گی یا تو باعث اضطراب اور اذیت خیز جانیں گے، یا باعث مسرت واطمینان قرار دیں گے۔ جذبات کی یہ شدت غیر معمولی طور پر ہمیں اپنے کردار کے کسی حصے یا واقعے میں نظر آئے گی، اگر وہ منفی رنگ رکھتی ہے اور اس کا باعث ایسے محرکات ہیں جن سے فکری، طبعی یا جسمانی اور روحانی سطح پر ہم نے دکھ درد یا غم کے جذبات محسوس کیے ہیں اور ان کی ''شدت'' سے دو چار ہیں، اور وہ محرکات یا اسباب ہمارے اعصاب پر اس طرح سے اثر انداز ہوئے ہیں کہ ہم ان کو بیرونی محرکات کا نام دے سکتے ہیں تو پھر یہ تشدد بیرونی کہلائے گا۔ جو باہر سے آیا ہے۔ جو ہماری ذات پر کسی دوسرے فرد یا افراد یا ادارے کے توسط سے اثر انداز ہو رہا ہے اور اگر تشدد کے محرکات محض اندرونی سطح یعنی ہمارے اپنے لاشعوری جذبوں اور تحت الشعور سے ابھر کر

ہماری ذات کو گرفت میں لے رہے ہیں اور ہم کسی کام کو کرنے کے بارے میں سوچنے لگے ہیں اور کسی خاص عمل کو تشکیل دے رہے ہیں اور اس عمل کے نتیجے میں کسی خوف یا ڈر یا غصے اور نفرت کے جذبات سے دو چار ہیں تو تشدد کا یہ رنگ جو ہمارے اعصاب پر ''تشویش'' یا کسی سطح پر غیض و غضب کا باعث بن رہا ہے، محض ہمارا اپنا اندرونی معاملہ ہوگا۔ تشدد کی یہ سطح باطنی یا اندرونی کہلائے گی جسے ہم (Inner or Psychological Violence) اندرونی یا نفسیاتی تشدد قرار دیں گے۔ مثلاً اپنے نفس کو کسی اذیت میں از خود مبتلا کرنا۔ مثال کے طور پر خود اذیتی، خود سوزی اور خودکشی وغیرہ!

''تشدد'' کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے اس طرح بعض اور نفسیاتی اصول ہمیں یہاں زیر بحث لانا پڑیں گے۔

انسانی ذہن کے تین بنیادی سرچشمے:

''تشدد'' کی نفسیات کو معروضی سطح پر سمجھنے کے لیے ہمیں انسانی ذہن کے تین بنیادی سرچشموں کو بھی زیر غور رکھنا پڑے گا۔ یہ تین سرچشمے تمام انسانی فکر اور جذبات اور انسانی کردار و عمل کی تعمیر اور تشکیل میں نہ صرف ''رونما'' ہوتے ہیں، بلکہ انہی کے طفیل ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک تسلسل اور ترتیب کی کیفیت رہتی ہے۔ اگر ان کا سلسلہ ٹوٹ جائے تو ہمارا اپنے آپ سے بھی ''ادراک'' اور جذباتی تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ ہم اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے شعور سے نہ صرف محروم ہو جاتے ہیں بلکہ ہماری پرورش اور نشوونما میں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تین سرچشمے ہیں۔ ''شعور'' تحت الشعور اور لاشعور۔'' ان تینوں سرچشموں کی آگے اپنی اپنی چھوٹی بڑی گزرگاہیں اور شاہراہیں ہیں۔ مثلاً شعور کی سطح پر ہماری توجہ کا مرکز ہر آن تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ہماری نظر ہماری سماعت اور دیگر حواس اپنے اپنے وسیلوں سے ہمیں ہماری اردگرد کی دنیا اور ماحول سے ہر لمحہ آگاہ رکھتے ہیں۔ ہماری توجہ بجلی کی سرعت کے ساتھ ادھر سے ادھر سفر کی حالت میں یا یوں کہہ لیجئے ہر آن مائل پرواز رہتی ہے۔ کبھی کوئی آواز کبھی کوئی منظر کبھی کوئی خوشبو یا بو یا کبھی کوئی باطنی خیال یا یاد ہماری توجہ کو اپنی طرف بلاتی ہے۔ پھر کوئی اور واقعہ یا حادثہ یا منظر ہمیں کسی اور طرف دھیان دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ سب شعور کا کھیل ہے ہم ہر قسم کا ادراک، شعور، سمجھ بوجھ، شناسائی اور علم

اسی ''شعور'' کے سرچشمے سے حاصل کرتے ہیں اور جو کچھ بھی فوری طور پر یا جب بھی ہم چاہیں، فکر اور غور کے بل بوتے پر ہم اپنے ''ذہن'' یا فہم و فراست میں موجود اور حاضر پاتے ہیں۔ وہ سب کچھ ہمارے شعور کا ہی حصہ ہے۔ یا جو کچھ ہم بوقت ضرورت آسانی سے یا کسی حد تک کوشش سے یاد کر کے اپنے شعور میں ماضی کے واقعات، حادثات اور معلومات حال کی دہلیز پر لا کھڑا کرتے ہیں وہ تمام ''یادیں'' بھی ہمارے شعور اور ادراک کا حصہ ہیں اور ہم ان تمام یادوں کا تحت الشعور سے یعنی شعور کی نچلی منزل سے بوقت ضرورت اوپر شعور کی دہلیز پر لے آتے ہیں۔ یہ سب ''یادٗ'' کا حصہ ہیں۔ جنہیں ہم تحت الشعور کے ''سٹور'' یا گودام میں جمع رکھتے ہیں۔ اس ''گودام'' سے نیچے بھی ایک عظیم ''تہہ خانہ'' ہے جسے ہم لاشعور کا نام دیتے ہیں۔ اسے ''تہہ خانہ'' کہنا دراصل کافی نہیں۔ یہ دراصل یادوں کا ایک سمندر ہے جس کی کئی تہیں ہیں اور بے انداز گہرائیاں ہیں۔ اس میں تمام انفرادی بھولی بسری لیکن متحرک یادیں اوپر کی سطح پر تیر رہی ہوتی ہیں اور ہمارے ذہن، فکر اور جذبے ان سب کو متاثر کر رہی ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان کے نیچے وہ انفرادی، سماجی اور تمام انسانی ذخیرے پوشیدہ ہوتے ہیں، وہ تمام خزینے ڈوبے ہوتے ہیں جو انسانی تاریخ سے بھی ماورا اور قدیم تر ہیں۔ ان میں وہ سب کچھ جو ہماری ارتقاء اور نشوونما کے رنگ میں ہم سے پہلی نیم انسانی نسلوں پر گزرا ہے، باقاعدہ تہہ بہ تہہ لاشعور کی گہرائیوں میں موجود ہوتا ہے۔ اس میں اجتماعی لاشعور اور اس کے علاوہ ماورائی لاشعور بھی شامل ہوتا ہے اور نہ جانے کیا کیا کچھ ہماری قدیمی روایات، اساطیر اور دیومالائیں ہمارے تمام انسانی جذبوں کی نشوونما کی کہانی، ہماری حسیات اور ان کے محرک ہونے کے سبب ماضی اور حال کے پرتو اور طرح طرح کے رنگ پوشیدہ ہوتے ہیں جن کا اظہار بعض اوقات ہمارے خوابوں میں اور ہمارے تخلیقی تصورات اور ادبیات اور فنون میں جھلکتا اور اجاگر ہوتا نظر آتا ہے۔ کبھی کسی علامت اور استعارے کی صورت میں اور کبھی کسی کہانی یا نظم یا بت یا کسی عمارت کی جلوہ گری میں اور یا پھر کسی سنگین انفرادی واقعے کی صورت میں، جس میں قومیں ایک دوسرے پر چڑھائی کر کے قتل و غارت اور جنگ و جدل کی المناک داستان کو وجود دیتی ہیں۔

قصہ مختصر شعور سے مراد توجہ، دھیان، ہوش و حواس جو عالم بیداری میں ہمیں میسر ہوتے ہیں اور وہ تمام ادراک، حسیات اور جذبات ہیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اسے ذی ہوش

انسانی نفس کی شعوری قرار دیا جا سکتا ہے۔ تحت الشعور میں وہ تمام مناظر، خیالات، تصورات، واقعات اور جذبات ہیں جن کو ہم ارادی اور غیر ارادی طور پر عالم شعور میں لا سکیں۔ یہ انسانی نفس یا وجود کا ایک رنگ میں عالم موجود یا ''عالرم شہادہ'' ہے جس کو ہم جب چاہیں شعوری سطح پر ''حاضر'' کر سکتے ہیں۔ چاہے وہ ہماری فوری توجہ سے کسی حد تک ''غائب'' کے مقام پر موجود کیوں نہ ہو۔ لیکن ضرورت پڑنے پر جب ہم اسے ''غائب'' سے ''شاہد'' یا حاضر کی صورت میں اپنے سامنے پیش کر سکیں، تو یہ سب کچھ ''تحت الشعور'' میں شمار کیا جائے گا۔ یہ یادداشت کا وہ ضروری اور فعال حصہ ہے جسے ہم جب چاہیں بازیافت اور دریافت کر سکتے ہیں۔ تیسرے حصے میں، یعنی ''لاشعور'' میں ہماری حسیات، جذبات، خیالات اور تصورات کا وہ بحرِ بے کراں ہے جو ہر طرف اور ہر سو موج زن ہے۔ جس کی گہرائیوں کی کئی سطحیں ہیں۔ انفرادی بھی، اجتماعی بھی، نسلی اور قومی بھی اور عالمگیر سطح پر انسانی بھی اور پھر ماورائی اور روحانی بھی۔ لاشعور انسانی ''یاد'' اور انسانی ''اساس'' کا وہ اہم خزینہ اور دفینہ ہے جو عام طور پر ہماری شعوری سطح کی گرفت میں نہیں ہوتا۔ وہ یا تو ہمیں بھول گیا ہے یا ہم اسے بھولے ہوئے ہیں لیکن وہ ہماری ذات کے نہاں خانوں میں کچھ اس طرح متحرک رہتا ہے کہ ہم اس کے اثرات سے شعوری سطح پر باخبر نہیں ہوتے لیکن اس کی ''گرفت'' میں ضرور ہوتے ہیں، ہمارے تمام باطنی، جبلی قوا اور توانائیاں اس میں پنہاں ہوتی ہیں۔ اس ''لاشعوری سطح'' کی جدید دریافت اور اس کے اثرات کے بارے میں جدید نفسیات کے ایک مدرسہ فکر یعنی ''تحلیل نفسی'' والوں نے اور کارل گستاف یونگ کی ''تجزیاتی نفسیات'' نے بہت مفید اور موثر کام ہمارے سامنے باقاعدہ ایک ''علم'' کی صورت میں پیش کیا ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ کس طرح تمام انسانوں کے انفرادی، خاندانی، وراثتی اور نسلی لاشعور کی یادداشتیں ہماری اساطیر اور دیو مالا میں موجود ہوتی ہیں اور ان کے تجزیے سے ہم اپنی شعوری سطح کے بہت سے محرکات کا صحیح طور پر جائزہ لے سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ''تشدد'' کی واردات چاہے وہ انفرادی نوعیت کی ہو یا اجتماعی شکل اختیار کر جائے اس کی وجوہات محض شعوری سطح پر موجود ہوتی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ بعض لاشعوری محرکات اس کی تہہ میں کارفرما ہوں جن کا رشتہ ہمارے قبیلے یا قوم کے بھولے بسرے ''انتقام'' یا ایسے سے وابستہ ہو۔ اس لیے فرائڈ اور یونگ دونوں نے اپنی اپنی سطح پر جدید علم نفسیات کے بعض

اصول قدیم یونانی اور لاطینی دیو مالاؤں سے اخذ کیے ہیں۔ مثلاً ''نرگسیت''۔ اور ایڈیپس کی الجھن (Oedipus Complex) اور کارل یونگ کے ''سائیکی'' ''پرسونا'' اور دیگر تجزیاتی نفسیات کے اہم اصول۔

بہرحال اس رنگ میں جدید نفسیات نے ہمیں دنیا کے تمام علاقوں اور نسلوں کے قدیم روایتوں اور علم الانسان کی طرف متوجہ کیا اور ہمیں سمجھایا کہ ان قدیم قصوں اور روایتوں میں انسانی جذبات کی شدت اور حدت کی کئی اہم داستانیں اور ''یادداشتیں'' محفوظ ہیں۔ ان کو سمجھنے اور سمجھانے سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں جو ''قیامتیں'' گزری ہیں اور جو ''تشدد'' کے سنگین دور آئے ہیں ان میں کیا ''محرکات'' پوشیدہ تھے۔ بعض اوقات یہی محرکات، جدید انسانی کو بھی لاشعوری سطح پر انفرادی یا گروہی یا لسانی اور مذہبی اعتبار سے ''تشدد'' پر اندر ہی اندر سے اکسا رہے ہوتے ہیں۔ ان پوشیدہ اور پنہاں عوامل کو نفسیاتی سطح پر نہ سمجھنے کے باعث ہم ان کا صحیح ادراک حاصل نہیں کر سکتے اور نہ ہی تشخیص کر سکتے ہیں اور نہ ہی موثر علاج کی کوئی صورت ہمیں دیکھائی دیتی ہے۔ جدید دور میں موجودہ تشدد کا سیلاب ہمیں اب مجبور کر رہا ہے کہ ہم ان اسباب کو بھی دریافت کریں جو ہماری شعوری سطح پر کارفرما تو نظر نہیں آتے لیکن انسانی لاشعور میں موج زن ہونے کی وجہ سے ہمارے عالمی انسانی کردار کو بری طرح متاثر کر رہے ہیں!

انسان کے بنیادی جبلی قوا (Instincts)

موجودہ نفسیات انسان کوایک اور زاویہ نظر سے دیکھتی ہے۔ وہ ہے انسان کے بنیادی جبلی قوا یا توانائیوں کا تجزیہ اور محاسبہ۔ حیوانوں کی طرح اور دیگر جانوروں کی مختلف اقسام سے الگ جب ہم انسان کی نفسیاتی ساخت پر غور کرتے ہیں، تو ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں ہی کچھ ایسے بنیادی جبلی تقاضے ودیعت کیے گئے ہیں جو اس کی نشوونما میں ''فطری محرکات'' کا کام دیتے ہیں۔ یہی بنیادی محرکات جو جذباتی بھی ہوتے ہیں اور ادراکی بھی، ان کی نشوونما اور پرورش نہ صرف ماں باپ اور خاندان کے ماحول میں ہوتی ہے بلکہ خاندان کے علاوہ باہر کا معاشرہ یعنی ''مدرسہ'' ماحول، معاشرہ اور معاشرت کے تمام ادارے شامل ہو جاتے ہیں۔ ان بنیادی عوامل اور محرکات کو جو

ہر فرد کی جبلی ساخت سے تعلق رکھتے ہیں مختلف رنگوں اور ڈھنگوں میں اس کی پرورش اور پرداخت کرتے ہیں۔ مثلاً محبت کا جذبہ، نفرت کا جوش، غم کا صدمہ اور تمام دوسرے بنیادی جذبے یعنی ماں باپ سے محبت، لوگوں میں ایک دوسرے سے مل جل کر رہنا اور فطری غم و غصے اور عشق و محبت کا اظہار۔ اپنی چیزوں اور اشیاء اور لوگوں سے لگاؤ۔ ''انفرادی ملکیت'' کا حصول اور دولت کی خواہش۔ یہ تمام فطری تقاضے ہیں جن کو ''معاشرہ'' اپنے ماحول میں ہموار اور استوار کرتا ہے۔ کبھی ان جذبوں کو ابھارتا ہے تو کبھی ان کو دباتا ہے۔ یہ تمام عملی جبلی طاقتوں اور قوا کی پرورش اور ارتقا کا عمل ہوتا ہے، جو کہ ہر فرد ماں کے رحم سے اپنی موت اور قبر کی آغوش تک سیکھتا اور سکھاتا رہتا ہے۔

ہمارے ماں باپ، ہمارا خاندان، تعلیمی ادارے، سوسائٹی کے مختلف طبقات اور نظام، کارخانے، ملازمتیں، ذرائع معاش، ذرائع پیداوار۔۔۔ یہ تمام ہمارے بنیادی جبلی تقاضوں اور جبلی قوا کی وجہ سے نہ صرف متحرک رہتے ہیں بلکہ ہماری تعلیم اور تربیت کا انفرادی سطح پر انہی کی وجہ سے ایک نظام جاری و ساری رہتا ہے۔ معاشرہ افراد سے کچھ سیکھتا ہے اور پھر انہی افراد کو سبق سکھاتا بھی ہے۔ یہ لین دین جذباتی اور فکری سطح پر ہر وقت رواں دواں رہتا ہے۔

یہ بنیادی جبلی تقاضے یا قوا کیا ہیں؟ مثال کے طور پر مادرانہ اور پدرانہ شفقت اور محبت کا جذبہ۔ اسی طرح اکٹھے رہنے کا جذبہ اور پھر ایک طرف غرور، تکبر اور غصے کا جذبہ تو دوسری طرف انکساری، عاجزی، فروتنی اور مجبوری کا جذبہ۔ پھر جنسی محبت کا جذبہ اور پھر احساس تحیر یعنی حیرت کا جذبہ اور حیرانگی کی کیفیت۔ گھر اور ملکیت بنانے کا جذبہ۔ کسی جگہ سے انس اور محبت۔ پھر جانچ پڑتال، جستجو اور جاننے کا شوق۔ تسخیر اور فتح کرنے کا جذبہ۔ دوسرے کو زیر کر لینا، دبوچ لینا، یہ تمام وہ بنیادی جبلی محرکات ہیں جو انسان میں اس کی فطری ساخت کے مطابق ہوتے ہیں اور دوسرے حیوانوں اور جانوروں میں بھی ان کی فطری ساخت کے مطابق تھوڑے اور بہت بقدر ضرورت ان میں ''ودیعت'' کئے جاتے ہیں۔ یہ ان کے ''خلیوں'' میں موجود ہوتے ہیں اور محرکات کی مختلف نوعی صورتوں کو بیجوں (Seeds) کی شکل میں کسی حیوان یا انسان کے جسم میں کارفرما نظر آتے ہیں اور ''ماحول'' میں پرورش پاتے ہیں۔ یہ بنیادی تقاضے انسانی خلق کا حصہ ہوتے ہیں اور معاشرے کی

پرورش اور ضمیر کی نشو ونما کے ذریعے سے یہ آہستہ آہستہ اخلاق کی سطح اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ خلق اور خلق کا رشتہ، بیج اور کھیتی کا رشتہ ہے۔ ایک بیج ایک کھیتی کے بغیر پرورش نہیں پا سکتا۔ اسی طرح ہمارے بنیادی خلق یعنی جبلی تقاضے، معاشرے کی وجہ سے ہماری تہذیب اور تمدن کے بنیادی اخلاق بن جاتے ہیں۔ اس عمل کو نفسیات میں ایک سطح پر عمل ارتفاع یا تصعید یعنی Sublimation کا عمل قرار دیا جاتا ہے۔ انفرادی سطح پر یہ خلق اور خلق کا باہمی رشتہ اور اس کے مختلف رنگ ہمیں نظر آتے ہیں۔ جبلی طور بعض قوا ایک فرد کے حصے میں زیادہ آتے ہیں اور بعض دوسرے قوا اس میں کم ہوتے ہیں۔ کسی میں فطری طور پر غصہ یا جنس یا دوسروں سے ڈرنا زیادہ بھی ہوسکتا ہے اور کم بھی۔ یہی فرق افراد کے درمیان ان کی مختلف شخصیتوں اور کردار کے رنگ میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اسی لیے جب ان جذبوں کا ''شدت اظہار'' مختلف نوعیت کا ہوتا ہے تو تشدد کے رنگ بھی بدل جاتے ہیں۔ تشدد کبھی بدنی صورت اختیار کر لیتا ہے اور کبھی ذہنی اور جذباتی اور کبھی محض اقتصادی اور معاشرتی۔ یعنی حقہ پانی بند۔ یا اقتصادی پابندیاں اور شرائط جنہیں ہم مہذب معاشرے میں ''اقتصادی پابندیوں'' (Economic Sanctions) کا نام دیتے ہیں۔ تشدد کا اظہار تھپڑ مار کر بھی ہوسکتا ہے۔ گالی دے کر بھی ہوسکتا ہے۔ مذاق اڑا کر بھی ہوسکتا ہے۔ تمدنی یا اقتصادی بائیکاٹ کر کے بھی ہوسکتا ہے کہ آپ اس کو اپنی ''لاتعلقی'' کی سزا دیں کیونکہ انسان میں بنیادی جذبہ ہے کہ وہ سماج میں دوسرے افراد کے ساتھ منسلک رہے۔ جب ہم ''بنیادی حقوق'' تلف کرنے کا کوئی انداز بھی اپناتے ہیں تو ہم تشدد کا رنگ اختیار کر رہے ہوتے ہیں۔ انہی بنیادی حقوق کی حق تلفی کے باعث ہم افراد اور معاشروں کو بعض اوقات افلاس اور مظلومیت کی چکی میں پستے دیکھتے ہیں اور کبھی مزاحمت، غصہ، بغاوت اور آزادی کی کشمکش اور جنگ سے نبرد آزما پاتے ہیں۔ لیکن دونوں صورتوں میں ایک شدت اظہار کا رنگ ہوتا ہے اور ''تشدد'' کا عمل اپنا رنگ دکھا رہا ہوتا ہے۔ اسی لیے ''تشدد'' کی اخلاقی سطح اور جواز کیا ہوتا ہے، یہ اقدار کا مسئلہ ہے جو اس وقت موضوع سخن نہیں۔

یہاں جدید نفسیات کے حوالے سے ''جبلتی تقاضوں'' کا ایک اور رنگ میں ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ ''تحلیل نفسی'' کے مدرسہ فکر (Psycho-Analysis) کی بنیاد جب فرائڈ نے ڈالی تو اس نے دو بنیادی جبلتوں کا ذکر ضروری سمجھا ہے دراصل فرائڈ نے جبلتوں

کے نظام کو دو بنیادی حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی تا کہ ان کا تجزیاتی علم حاصل کیا جا سکے۔ اس نے ایک نفسیاتی عقیدے کے طور پر یہ اصول پیش کیا کہ ہر انسان میں دو طرح کے جبلی تقاضے کارفرما ہوتے ہیں۔ ایک کو ہم زندگی کی جبلت قرار دیں گے جب کے بل بوتے پر انسان کے ہاں زندہ رہنے کی تمام خواہشیں، تمنائیں اور امیدیں پروان چڑھتی ہیں۔ ان کو وہ زندہ رہنے کے تقاضے قرار دیتا ہے۔ جس کا انگریزی نام اس نے ''life Instinct'' رکھا۔ اس کے مقابل انسان میں ایک اور جبلت یا قدرتی تقاضا بھی کارفرما ہوتا ہے۔ جس کو فرائڈ ''موت کا جبلی تقاضا'' کہتا ہے۔ ایک ایسا تخریبی تقاضا بھی انسان کی جبلت میں پوشیدہ ہوتا ہے جو اسے موت اور فنا کی طرف گامزن کرتا ہے۔ اسے فرائڈ موت کا جبلی تقاضا کہتا ہے۔ یعنی ''Death Instinct''۔ جذبہ موت یا موت کی جبلت۔ اس طرح انسان ان دو جبلتوں یعنی جذبہ حیات اور جذبہ موت کے درمیان اپنے سماجی ماحول میں تربیت پا رہا ہوتا ہے۔ جب ان دو جبلتوں کے درمیان مناسب رنگ میں ''توازن'' نہیں رہتا تو یہ عین ممکن ہے کہ ایک انسان سے خود لاشعوری طور پر ایسے فعال سرزد ہوں کہ وہ خود اپنے آپ کو ہلاکت تباہی یا نقصان کی طرف دھکیل رہا ہو۔

اسی طرح فرائڈ نے انسانی توازن کو دوسرے نفسیاتی نام بھی دیئے۔ یعنی حقیقت کے شعور کا اصول۔ جسے وہ ''Reality Principle'' کا نام دیتا ہے۔ اس اصول کے برعکس انسانی نفس جو محض حیوانی جذبوں کی تسکین پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور ادھر مائل ہوتا ہے، اس کے لیے فرائڈ نے ''لطف اندوزی'' کا اصول وضع کیا کہ جب انسانی نفس غیر متوازن انداز میں ''لطف اندوزی'' کی طرف مائل ہو جاتا ہے تو پھر وہ نفس کی قدرتی اور حیوانی خواہشوں کی تسکین پر زور دیتا ہے جس کو ہم مذہبی اور نفسیاتی سطح پر ''نفس امارہ'' کا نام بھی دیتے ہیں۔ اس کو فرائڈ نے انگریزی اصطلاح میں (Pleasure Principle) کہا ہے۔

ان تمام فطری حیوانی جذبوں کا نام فرائڈ نے لاطینی زبان کی اصطلاح میں بہتر طور پر استعمال کیا جسے وہ ''اڈ'' (Id) کہتا ہے۔ یعنی مادی اور طبعی حواس کی تسکین کے مختلف تقاضے۔ ان طبعی تقاضوں میں فرائڈ کی نظر میں سب سے زیادہ طاقت ور اور زوردار جو طبعی تقاضا یا جبلت ہے وہ ہے جنسی جذبہ، جسے انگریزی میں ''Sex Instinct'' یا اردو میں جبلی جنسی تقاضا یا ''شہوانی قوت'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس تقاضے کی تسکین اور تکمیل اور اس کی

قوت کا اظہار فرائڈ کے نظریات کے مطابق انسانی زندگی کا اصل محور ہوتا ہے جس سے انسانی نفس تعمیر ہوتا ہے۔ انسانی نفس کی اس شکل وصورت کو وہ جنسی فطرت یعنی Libido کا نام دیتا ہے اور جب یہ انسانی فطرت کسی حد تک پختہ ہو جاتی ہے تو پھر انفرادی نفس کی تشکیل ہوتی ہے جسے وہ ایغو (Ego) یا خود شناسی یا خودی اور انسانی نفس کی انفرادی پہچان قرار دیتا ہے۔ اسی نفس یا خودی کی بلوغت اور اس کا متوازن پرورش پانا ہی فرائڈ کے ہاں حقیقت شناسی یا Reality Principle کا منبع قرار پا سکتا ہے۔ لیکن انسانی نفس پر ایک طرف سے اڈ اور شہوانی جذبوں کا زور ہوتا ہے تو دوسری طرف ان کے مقابل پر سماجی ضمیر اور سماجی اخلاق کی گرفت میں انسانی نفس جکڑا ہوتا ہے۔ اس سماجی ضمیر کو فرائڈ Super Ego یعنی فوق النفس یا ''فوق الانا'' کا نام دیتا ہے جو کہ اسے زندگی میں مسلسل معاشرے کی اخلاقی اقدار اور اخلاقی پابندیوں کی سلاسل میں جکڑے رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ تگ و دو انسانی زندگی کی اکثر الجھنوں اور جذباتی مسائل کا باعث ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ طاقتور خواہش جنس کا اظہار ہے جس کی وجہ سے انسان مختلف مسائل اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوتا ہے۔ فرائڈ کی نظر میں انسان کی انفرادی زندگی میں شدت اظہار اور ''تشدد'' کے اکثر مسائل کا پیدا ہونا جنسی اغراض و مقاصد کے تحت ہوتا ہے۔ ''جنسی تشدد'' کے حوالے سے فرائڈ کی نفسیات سے ہم بہت حد تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور جنسی جرائم اور غیر متوازن رویوں میں شعوری اور لاشعوری سطح پر فرائڈ کی نفسیات کے تجزیاتی تجربات سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

جدید نفسیات میں فرائڈ کے علاوہ تحلیل نفسی کے مدرسہ فکر سے منسلک دو اور مشہور ومعروف نفسیات دانوں کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ فرائڈ نے اس وقت کے معروضی حالات کے مطابق نفسیاتی بیماریوں کے تجزیوں میں ''جنسیات'' پر بہت زور دیا اور شاید کسی حد تک مبالغے کا پہلو بھی اس کی نفسیات میں داخل ہو گیا۔ لیکن اس کے شاگردوں اور ہم عصروں میں آڈلر (Adler) اور یونگ (Jung) کا ذکر بحال ضروری ہے۔ ایلفر ڈ آڈلر نے انفرادی نفسیات کا مدرسہ فکر قائم کیا۔ اس کا بنیادی نقطہ نظر یہ تھا کہ جنسی اور شہوانی جذبات کے علاوہ فرد کی زندگی میں اس کا ماحول، اس کا خاندان اور اس کی اپنی جگہ اور شناخت جو کہ اس کے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے حوالے سے ہوتی ہے یہ تمام عناصر بھی انفرادی نفسیات میں بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ ''شدت اظہار'' اور غیر متوازن انفرادی رویوں یا ذہنی اور

نفسیاتی امراض اور پیچیدگیوں میں محض جنس ہی فرد کی زندگی کا محور نہیں ہوتی بلکہ اس کا انداز فکر اور جذبات کا ایک مخصوص رویہ ہوتا ہے جس کو ہم اس کی زندگی کا رویہ قرار دے سکتے ہیں۔ آڈلر اس کو ''لائف سٹائل'' (Life Style) یا طرز زندگی کا نام دیتا ہے۔ یہ ''انفرادی طرز زندگی'' دراصل فرد کا محور ہوتا ہے جس کے ارد گرد وہ شب و روز گردش کرتا رہتا ہے۔ اگر یہ انفرادی طرزِ زندگی غیر متوازن یا الجھن زدہ ہوگا تو اس کی زندگی میں ایسے اثرات مرتب ہوتے رہیں گے جو اس کا رہن سہن اور طرز زندگی ناہموار اور دشوار گزار بنا دیں گے۔ غیر متوازن زندگی کے باعث اس کے ہاں ''تشدد'' کا رجحان بڑھے گا۔ کیونکہ وہ دوسرے افراد اور معاشرے سے عموماً متصادم رہے گا۔ اس کے ہاں خاص قسم کا احساس کمتری (Inferiority Complex) جنم لے گا اور اس کمتری کے احساس پر قابو پانے کے لیے جائز اور ناجائز حربے استعمال کرنے کا رجحان بھی فرد کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے اسی لیے اس کمتری کے احساس کو دور کرنے کی تگ و دو میں ہر فرد میں کسی حد تک دو رویے پرورش پا رہے ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ دوسرے لوگوں میں مل جل کر، ان کی معاشرتی زندگی میں بھرپور طور پر شامل ہو کر روز مرہ کے معلومات میں سرگرمی سے حصہ لے کر ان میں اپنا ایک منفرد مقام اور مرتبہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس رویے کو ایکسٹرو ورشن (Extroversion) کا نام دیا جاتا ہے۔ یعنی ''خارجی زندگی کا خوگر'' ہونا۔ دوسروں میں مل جل کر رہنے اور سماجی سطح پر اپنے آپ کو مصروف رکھنے کا جذبہ۔ اس کو کارل گستاف یونگ بروں بنی یعنی خارجی زندگی کے خوگر ہونے کے جذبہ میں شمار کرتا ہے۔ ان لوگوں کو وہ Extroverts کہتا ہے۔ اس کے برعکس وہ لوگ بھی ہیں جو بنیادی طور پر دروں بنی یعنی Introversion کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ تنہائی، اکیلے پن اور دوسروں سے بچ کر اور ہٹ کر اکلاپے یا اپنی باطنی زندگی میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کے ہاں معاشرے سے ذرا کٹ کر رہنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ وہ سوچتے زیادہ ہیں۔ معاشرتی زندگی میں کم ہی دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کے ہاں ذہنی اور جذباتی سطح پر انفرادی اور باطنی سرگردانی کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے ہاں بھی جب یہ طرز زندگی زیادہ غیر متوازن ہو جاتا ہے تو پھر ''شدت اظہار'' کی کئی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ جن میں تشدد اور غیر متوازن کردار کے مختلف رویوں کی عکاسی نظر آنے لگتی ہے۔

اسی طرح یونگ نے اپنی تجزیاتی یا تحلیلی نفسیات (Analytical Psychology) کے مدرسہ فکر میں اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی کہ جنسی تقاضوں اور رویوں کے علاوہ انسانی زندگی کی نشوونما میں اور بہت سے تمدنی، تہذیبی اور مذہبی عوامل بھی شامل ہوتے ہیں۔ جو انسان اپنے مخصوص معاشرے اور ماحول میں اپنے ارد گرد سماجی اداروں سے سیکھتا ہے۔ اس میں اس کا خاندان اس کا مدرسہ، اس کا معاشرتی ماحول اور پھر اس کی زندگی کے ارتقائی عمل میں تمام انسانی تہذیب کے ادوار اس کے شعور، تحت الشعور اور اس کے انفرادی اور اجتماعی لاشعور میں نہ صرف جھلک رہے ہوتے ہیں بلکہ اس کے کردار پر نامعلوم طور پر بعض اوقات بڑی تیزی سے اثر انداز ہو رہے ہوتے ہیں۔ انفرادی لاشعور میں یونگ کے نقطہ نظر کے مطابق بہت گہری اور عمیق سطحوں پر انسان کے قدیم ترین اجتماعی شعور کی عجیب و غریب جھلکیاں مستور نظر آتی ہیں۔ ان میں نسلی شعور بھی شامل ہوتا ہے اور علاقائی اساطیر اور دیو مالا بھی پنہاں ہوتے ہیں۔ ''علامتوں'' کا ایک وسیع ذخیرہ ایک گنجان جنگل کی صورت میں ہر طرف پھیلا ہوتا ہے۔ جس میں ہر انسان کی نشوونما اور ذہنی اور جذباتی ارتقا کے مختلف ادوار ہی مضمر نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات افراد کی زندگیوں میں بعض عجیب و غریب خوابوں، رویاء اور کشوف کی صورت میں گزرے ہوئے واقعات اور آئندہ آنے والے حالات اور حادثات کی علامتی انداز میں تصویر کشی بھی کی ہوئی ہوتی ہے اور پھر انہی انفرادی خوابوں میں بعض اوقات عجیب و غریب تصورات اور ادبی تخلیقات کے اہم عناصر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ کبھی شعروں اور شاعری کے حوالے سے کبھی افسانوں، کہانیوں، داستانوں اور ڈراموں کی صورتوں میں یہ افسانوی کردار جیتی جاگتی اساطیری حقیقتوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ انسانی زندگی کے بہت سے اجتماعی المیے اور جانکاہ حادثے ان علامتوں کی صورت میں اپنا اظہار کرتے ہیں۔

اسی طرح یونگ نے انسانی زندگی کی ایک اور بنیادی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ انسان بے شک ایک تخلیقی وحدت ہے۔ وہ ایک جنس ہے لیکن ہر انسان میں چاہے وہ مرد ہو یا عورت دو بنیادی عنصر یا اجزا ہیں۔ اسی لیے وہ ''انسانی'' کہلاتا ہے۔ یعنی دو بنیادی عناصر کا ایک مجموعہ ایک عنصر ''نسوانی'' یا زنانہ ہے اور دوسرا عنصر اس میں ''مردانہ'' ہے۔ انسانی شخصیت یعنی انسان کی ذات ان عناصر کا مجموعہ ہے۔ ان زنانہ اور مردانہ عنصر کو یونگ

انیما (Anima) اور انی مس (Animus) کہتا ہے۔ یہ دونوں اصطلاحات یونانی اساطیری نظام سے حاصل کی گئی ہیں۔ انیما اور انی مس کے اتصال سے انسان موجودہ صورت میں ارتقائی سطح پر نمودار ہوا۔ وہ پہلے ''ایک اکائی'' کی صورت میں تھا یعنی Uni-Cell کی شکل میں تھا۔ پھر اس نے خود اپنی حوا یا اپنے آدم کو پیدا کیا۔ یہاں ہم اس جھگڑے میں نہیں پڑتے کہ حوا نے آدم کو پیدا کیا یا آدم نے حوا کو۔ جدید سائنس تو بہرحال اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ شاید حوا نما انسان پہلے وجود میں آیا اور اس ہر مو فروڈائیٹ (Hermophrodite) نے مرد کو بطور جنس جنم دیا اور پھر عورت اور مرد کی جنس سے زندگی کا آغاز ہوا اور جوڑوں کی شکل میں دو عناصر انسان کی جنس میں مذکر اور مونث کی صورت میں ظہور پذیر ہو گئے۔ یہاں سے ان کی محبت کا آغاز بھی ہوا اور رفاقت کا بھی اور اس طرح نفرت اور رقابت کا بھی۔ ان کی اولاد نے ہابیل اور قابیل کی صورت میں سب سے پہلے ''تشدد'' کا آغاز کیا۔

قصہ مختصر انسانی نفسیات میں تشدد کا عمل دخل ہمارے نفس کے تغیر و تبدل سے ہی ہوتا ہے۔ ہمارے نفس کی طبعی اور حیوانی حلت ہمیں اپنے بنیادی فطرتی تقاضوں کے حصول اور تسکین کی تلاش میں حوس کی جنت حاصل کرنے کی تلقین کرتی رہتی ہے اور ہمارا ضمیر اور ہمارا اخلاق اور ہمارے معاشرے کا دباؤ ہمیں ایک ''توازن'' پر مجبور کرتا ہے۔ جب ہم غیر متوازن رجحانات کا شکار ہوتے ہیں اور ہمارے جذبے اور تمنائیں اور خواہشات ہمیں مشتعل کر کے تشدد پر ابھارتے ہیں تو ہم تشدد کی صورت میں دوسروں کو اپنا شکار بنانے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہتھیار طرح طرح کے ہو سکتے ہیں۔ وہ طبعی اور ذہنی بھی ہو سکتے ہیں۔ جنسی اور بدنی بھی ہو سکتے ہیں۔ برچھے بھالے اور بم دھماکے بھی ہو سکتے ہیں۔ اقتصادی حقہ پانی بند کرنے کی شکل میں بھی ہو سکتے ہیں اور ان میں اغواء اور ڈکیتی بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ ''تشدد'' چاہے شدید محبت کی شکل میں ہو کہ شدید نفرت کی صورت اختیار کر جائے کہ وہ اذیت ناک ہو جائے۔ چاہے وہ کسی سطح پر کسی شکل میں بھی ہو، تشدد ہی کہلائے گا۔

تشدد کی نوعیت اور اس کے اجزائے ترکیبی

اس کتاب کے شروع میں اس بحث کا آغاز ہوا تھا کہ تشدد کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس کی معنوی اور کسی حد تک معروضی تعریف ضرور کرنا پڑے گی تا کہ ہم تشدد کے دائرہ کار اور اس کے اثرات کو معین رنگ میں جانچ سکیں۔ ہم نے کہا تھا کہ کوئی بھی ایسا عملی اقدام جو انفرادی یا اجتماعی سطح پر کسی فرد یا گروہ کو ذہنی، جذباتی یا بدنی سطح پر غیر معمولی تشویش، اضطراب یا جسمانی اذیت میں مبتلا کر دے اور جس کا معاشرتی یا اخلاقی یا قانونی جواز نہ ہو وہ تشدد کے زمرے میں شمار کیا جائے گا۔کوئی بھی ایسا متشدد عمل یا حرکت جس کی توضیح ہم تربیت یا سزا کے رنگ میں نہ کر سکیں اور اس کا جواز ہمارے پاس مروجہ معاشرتی قدار کے حوالے سے میسر نہ ہو سکے تو وہ عمل یا حرکت کسی بھی نوعیت کی ہو، چاہے وہ ذہنی و جذباتی ہو یا جسمانی، وہ تشدد شمار ہو گی کیونکہ اس سے غیر معمولی تشویش، اضطراب یا اذیت کسی فرد یا گروہ کو پہنچائی گئی ہے۔ یعنی کسی بھی عمل یا حرکت کا ایسا شعوری اظہار جس کی شدت ایسا رنگ اختیار کر جائے کہ وہ باعث تشویش یا اذیت کا موجب بن جائے، چاہے یہ اذیت، ذہنی سطح پر ہو یا جسمانی سطح پر ہو یا جذباتی اور روحانی سطح پر یا اس میں یہ عناصر شامل ہوں تشدد ہی کی کوئی نہ کوئی صورت کہلائے گی۔ اعصاب اور اس کے نظام پر کوئی ایسا دباؤ جو غیر معمولی شکل کا ہو اور وہ خارجی اثرات سے کسی دوسرے فرد پر مسلط کیا جائے تو وہ ''تشدد'' میں ہی شمار ہو گا۔ مثلاً کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر شدت اظہار کسی فعل یا حرکت سے اس رنگ میں کرتا ہے کہ دوسرا شخص غیر معمولی اعصابی دباؤ محسوس کرتا ہے جس سے اسے ''اذیت'' سے دو چار ہونا پڑتا ہے تو یہ تشدد کی ہی صورت ہو گی۔ چاہے یہ شدت اظہار کسی سطح پر ہی کیوں نہ ہو۔ ذہنی ہو جذباتی یا جسمانی یہ ''تشدد'' ہی ہو گا۔ تشدد کی تحریک خارجی اسباب سے عموماً بروئے کار لائی جاتی ہے۔ لیکن اس کے اسباب باطنی اور خارجی بھی ہو سکتے ہیں۔ تشدد ایک ایسا نفسیاتی عمل ہے جس کے نتیجے میں اعصابی دباؤ محسوس ہوتا ہے اور اس

میں اذیت کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ یہ جسمانی اذیت ہو یا جذباتی اور ذہنی۔ لیکن اس اذیت میں جذباتی تاثیر کا ہونا لازمی امر ہے۔ چاہے وہ خوف اور ڈر اور احساس شکست اور ناامیدی پیدا کرے یا اس کے برعکس غم، غصہ، طیش اور اشتعال کے جذبات ابھارے۔ ''تشدد'' ''بزدلی'' بھی پیدا کرسکتا ہے اور ''سنگ دلی'' بھی۔ تشدد کے عمل اور ردعمل دونوں ہماری جبلی توانائی اور ساخت کے علاوہ ہمارے مخصوص تمدنی ماحول اور تعلیم وتربیت کا بھی اثر ضرور ہوگا اور اس وقت کے ذہنی اور جذباتی توازن پر بھی اس بات کا انحصار ہوگا کہ ہم تشدد کے عمل اور ردعمل کی صورت میں کیا کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یا کس طرح اپنے جذبات پر قابو پا لیتے ہیں۔

اب ہم تشدد کی ماہیت اور اس کے اجزائے ترکیبی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تشدد میں شعوری اور لاشعوری اور ادراکی عنصر بھی ہوتا ہے۔ اس کا جذباتی پہلو بھی ہوتا ہے اور اس کا عملی اور حرکی رخ بھی ضرور ہوتا ہے۔ تشدد جب کیا جاتا ہے تو شعوری سطح پر کسی نہ کسی حد تک ایک منصوبہ بندی ضرور ہوتی ہے۔ چاہے وہ بہت سرعت کے ساتھ ایک وقتی ضرورت کے لیے فوراً عمل میں لائی گئی ہو یا ایک سوچے سمجھے منصوبے کے ساتھ کوئی تشدد کی واردات بروئے کار لائی گئی ہو۔ پھر اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ اس کا ایک کردار ہوتا ہے۔ آخر میں اس عمل یا حرکت یا فعل کو اختیار کر کے ہم ایک جذباتی کیفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف اپنا انتقام لیتے ہیں۔ غصہ ٹھنڈا کرتے ہیں یا دل کی تسکین پا لیتے ہیں تو دوسری طرف جس پر تشدد وارد کیا جاتا ہے اس کو کسی نہ کسی رنگ میں اذیت میں مبتلا ضرور کرنا چاہتے ہیں اسی طرح تشدد کے اجزائے ترکیبی کے بھی چار اہم پہلو ہیں: (i) پہلا تشدد کا نقطہ آغاز، اس کا جذباتی یا جبلی سرچشمہ ہے کہ اس کا آغاز کس جذبے کے تحت ہو رہا ہے یعنی وہ پیدا کس جبلی توانائی یا یورش کے تحت ہو رہا ہے اس میں کون سا جبلی تقاضا موجود ہے ہم کس چیز کو حاصل کرنا چاہتے ہیں یا کسی چیز کو مٹانا چاہتے ہیں؟ ہم انتقام لینا چاہتے ہیں یا کسی کو بدنام یا رسوا کرنا چاہتے ہیں؟ یا دو تین جبلی تقاضوں کے تحت تشدد کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے کہ دوسرے شخص پر دہشت بھی سوار ہو جائے، اسے نقصان بھی پہنچ جائے اور ہمیں کوئی مالی یا جانی فائدہ بھی پہنچ جائے کوئی چیز چرا بھی لیں یا لوٹ بھی لیں۔ یا اغوا بھی کرسکیں۔ تشدد کا پہلا سرچشمہ تو اس کا نقطہ آغاز یا طبعی تقاضا ہے جس کی

تسکین کے لیے تشدد کی راہ اختیار کی جا رہی ہے۔ دوسرا عنصر تشدد کا مقصود یا گول یا مطمح نظر ہے۔ کسی ایک مقصد یا کئی مقاصد کو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مقاصد میں فائدے یا فائدوں کا حصول ہے۔ یا دوسرے کو نقصان پہنچانا۔ اس کو اذیت دینے کے ساتھ اس کی کسی پہلو سے ''تخریب'' کرنا بھی ہے۔ تشدد کا تیسرا عنصر اس کا ''نشانہ'' یا ہدف ہے۔ وہ کوئی شخص بھی ہوسکتا ہے۔ کوئی گھر یا مکان ہوسکتا ہے۔ کوئی فصل یا خزانہ کوئی قیمتی چیز ہوسکتی ہے۔ کسی شخص کو زخمی کرنا یا اس کو مار دینا۔ یا کسی گھر کو مسمار کر دینا یا کوئی فصل تباہ کر دینا یا کوئی خزانہ لوٹ لینا۔ یا کسی چیز یا فرد کو اغوا کر لینا۔ کوئی بھی نشانہ یا ہدف ہوسکتا ہے لیکن کسی نہ کسی نشانے کا ہونا ضروری ہے۔ تشدد کا چوتھا عنصر یا جزو یہ ہے کہ تشدد کے لیے کون سے ذرائع یا وسائل یا طریقہ کار اختیار کیے گئے ہیں۔ گالی گلوچ سے تشدد اختیار کیا گیا ہے کہ گولی چلا کر مقصد پورا کیا گیا ہے۔ یا پھر نفسیاتی سطح پر تشدد کے ذرائع اختیار کیے گئے ہیں۔ خبر یا افواہ کے ذریعے سے، اشتہار چھاپ کر یا بم پھینک کر یا میزائل گرا کر یا طیارہ اغوا کر کے۔ یا حقہ پانی بند کر کے یا کسی برے نام سے اس کو یاد کر کے تشدد کا رنگ اختیار کیا گیا۔ جب آپ کسی شخص یا گروہ کو ''سرطان'' کے نام سے بار بار پکاریں گے یا اسے ناپاک قرار دیں گے یا اس کو نطفہ حرام ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کا ''میڈیا'' استعمال کریں گے تو یہ تشدد کے وسائل اور ہتھیار ہی شمار کیے جائیں گے۔ تشدد کا کوئی نہ کوئی وسیلہ یا ہتھیار ہونا ضروری ہے۔ چاہے وہ گالی ہو یا گولی، تھپڑ ہو یا ایٹم بم!!

ظاہر ہے کہ تشدد کے لیے فاعل کا ہونا بھی ضروری ہے اور ''مفعول'' کا بھی۔ تشدد کرنے والا فاعل ہے اور جس پر تشدد کیا جائے وہ مفعول ہے۔ فاعل ایک فرد یا ایک گروہ یا ایک معاشرہ بھی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح جس پر تشدد کیا جائے وہ ایک فرد بھی ہوسکتا ہے۔ تشدد کا دائرہ تنگ ہو کر ایک فرد پر مبنی ہوسکتا ہے۔ تشدد کرنے والا وہی شخص خود بھی ہو سکتا ہے جس پر تشدد کیا جا رہا ہے۔ اذیت کوش بھی اور اذیت طلب بھی۔ جبلت مرگ بھی کبھی قاتلانہ اور متشددانہ رنگ اختیار کر سکتی ہے اور اگر آپ دروں بیں ہوتے ہوتے ''نرگسیت'' کا شکار ہو گئے ہیں تو عین ممکن ہے کہ آپ جب اپنے آپ کو مار یا مسمار کر رہے ہوں تو ایک رنگ میں آپ تمام جہان کو لقمہ اجل بنا رہے ہوں۔ ''جبلت مرگ'' جارحیت کا روپ بھی اختیار کر سکتی ہے۔

دوسری طرف فاعل اور مفعول دو الگ وجود بھی ہو سکتے ہیں، دو گروہ بھی ہو سکتے ہیں اور دو قومیں اور دو یا دو سے زیادہ مملکتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے اشتعال انگیز اور تشدد آمیز انفرادی واقعات سے لے کر بڑی بڑی عالمی جنگیں، لشکروں کے حملے بغاوتیں، انقلاب اور نسل کشیاں تشدد کے مظاہر ہی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ان کی اخلاقی سیاسی اور معاشرتی توجیہات کو اگر آپ کچھ دیر کے لیے قابل اعتنا نہ سمجھیں تو جواز تو پھر ہر بات کے لیے ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ انفرادی تشدد کی سنگین وارداتوں میں بھی کم از کم ذہنی بیماری اور جذباتی دباؤ اور الجھن کا سہارا تو اب اکثر لے ہی لیا جات اہے۔ یہاں تک کہ قتل کی واردات میں اب ترقی یافتہ ملکوں میں نفسیات دان مجرم کا دفاع کرنے کے لیے عدالتوں کا دروازہ اکثر کھٹکھٹاتے نظر آتے ہیں کہ مجرم ذہنی بیماری کی وجہ سے مجبور تھا اس لیے بے قصور تھا! تشدد کے ان چار پہلوؤں کا اگر ذرا تفصیل کے ساتھ ایک ایک کر کے تجزیہ کر لیں تو ہمارے لیے آنے والے موضوعات پر عبور حاصل کرنا زیادہ آسان ہو گا۔

تشدد کا جذباتی یا جبلی سرچشمہ (Source)

جذبوں اور جبلتوں کے تعارف میں یہ ذکر موجود تھا کہ انسانی نفس اور ضمیر کے زیر تربیت رہ کر اور معاشرے کے مختلف عناصر سے اختلاط کے باعث جبلتوں کی طبعی حالت میں خاصی تبدیلی آ جاتی ہے اور ان کی شکل خاصی تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہماری خلقی اور طبعی طاقتیں مثلاً غصہ، طیش اور حملہ آور ہونا آہستہ آہستہ شجاعت، بہادری اور صبر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے نفس پر قابو پا کر جبلتوں کا فوری اظہار نہیں کرتے۔ خَلق اب خُلق کا رنگ اختیار کرتی جاتی ہے۔ شجاعت، احسان، تحمل، صبر اور قناعت کے تقاضے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ابھرنے لگتے ہیں۔ ہم اکثر غصہ ''پی'' جاتے ہیں یا پھر اس کا اظہار کسی ایسے مناسب وقت پر اپنے مفاد کے مطابق کرتے ہیں جب ہمارے لیے نتائج بہتر طور پر ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اس لیے متمدن اور تہذیب یافتہ افراد اور قوموں کے تشدد کے سرچشمے محض فطری تقاضوں اور جبلی جذبوں پر انحصار نہیں کرتے۔ ان میں سوچ سمجھ اور فکر و تدبر بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح تشدد کا سرچشمہ محض جبلی تقاضہ نہیں رہتا بلکہ تشدد کا محرک اور اصل سرچشمہ باقاعدہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت بروئے کار لایا جاتا ہے۔ کسی فرد گروہ یا قوم کو

تشدد کا نشانہ بنانے کے لیے ایسے ایسے محرکات کو استعمال کیا جاتا ہے کہ اذیت کی صورت محض جسمانی یا طبعی نہیں رہتی بلکہ اس میں ذہنی جذباتی اور روحانی عناصر زیادہ شدید نظر آتے ہیں۔ اس طرح اس فرد یا قوم کے اعصابی نظام کو رفتہ رفتہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کی صورت میں مفلوج اور معطل کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔

تشدد کا مقصد (Aim)

''تشدد'' محض ہنگامی صورت پیدا کرنے کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ تشدد کا ہر دفعہ کوئی خاص معین مقصد یا مطمح نظر ہو۔ تشدد کا مقصد اشتعال انگیز صورت حال پیدا کرنا بھی ہوسکتا ہے اور محض اپنے جذباتی دباؤ کو کم کرنے کے لیے بھی بعض اوقات لوگ تشدد کا سہارا لیتے ہیں لیکن جوں جوں معاشرہ ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ہو رہا ہے تشدد کے واقعات میں ایک خاص نقطہ نظر کے تحت کسی مخصوص مقصد کا حاصل کرنا یا ایک سے زیادہ مقاصد کا حصول بھی ہوسکتا ہے اور عموماً ہوتا ہے۔ تشدد کی واردات کی کامیابی کا انحصار ان معین مقاصد کا حصول ہی ہوتا ہے۔ تشدد کے مقاصد کچھ تو فوری نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ جن کو ہم قلیل المیعاد مقاصد (Short Term Goals) کہلاتے ہیں۔ مثلاً ایک تشدد یا دہشت گردی کا واقعہ پیش آتا ہے تو اس کا فوری مقصد کسی معاشرے میں دہشت پھیلانا یا ڈر اور خوف کی فضا پیدا کرنا ہی ہوتا ہے۔ یا محض یہی مقصد ہوتا ہے کہ دشمن کو ایک اچانک ششدر کرنے کا عنصر حاصل کیا جائے۔ جسے انگریزی محاورہ میں ''ناگاہی کا عنصر'' (Element of Surprise) کہا جاتا ہے۔ لمبی معیاد کے مقاصد میں ایسی واردات برپا کرنے کے پیچھے یہ منصوبہ بندی بھی ہوسکتی ہے کہ اس طرح سے اس ملک یا قوم کی معاشی اور معاشرتی شیرازہ بندی کو ہی بالکل ادھیڑ کر رکھ دیا جائے۔ تشدد کے واقعات کو اس طرح ترتیب دیا جائے اور خاص معین وقت میں اس معاشرے کے مختلف طبقوں کو درجہ بدرجہ اس طرح نشانہ بنایا جائے کہ پوری قوم کی تباہی کا منصوبہ اور اس سے وابستہ مقاصد حاصل کیے جاسکیں۔

جدید دور میں تشدد کے مقاصد جارحانہ بھی ہوتے ہیں اور مدافعانہ بھی یہ گروہی اور قومی سطح کے علاوہ ملکی اور بین الاقوامی بھی ہو سکتے ہیں۔ کسی ملک میں ایک سیاسی جماعت

یا گروہ اگر انتخاب اور ووٹ کے بل بوتے پر اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتی تو وہ تشدد کو اپنی قوت کا ذریعہ اظہار بنا سکتی ہے اور اس طرح دوسرے سیاسی گروہوں پر اپنی برتری ثابت کر سکتی ہے۔

انفرادی سطح پر جہاں تشدد ایک مریضانہ ذہن اور بیمار نفس کی پیداوار کر سکتا ہے اسی طرح قومی سطح پر بھی رجعت کہتری یا اسی قسم کا کوئی جذبہ یا قومی شکست اور ہزیمت کو چھپانے کے لیے یا اپنے لوگوں کو مغالطے میں ڈالنے کے لیے معاشرے کے کسی ایک حصہ پر تشدد کی ابتدا یا انتہا کی جا سکتی ہے تاکہ اس ڈھنگ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز تبدیل کر دیا جائے۔ تشدد کو قومی سطح پر بتدریج ایک انقلاب کا پیش خیمہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔ خونی انقلاب کی ابتدا عموماً تشدد کے واقعات اور بلوہ اور ہنگاموں سے ہی ہوتی ہے۔ امن و امان جب درہم برہم ہو جاتا ہے تو پھر حالات ایسا رخ اختیار کرتے ہیں کہ کوئی گروہ یا تنظیم ان سے فائدہ اٹھا کر کسی قوم کے مقدر کو بدلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس تشدد کے اجتماعی استعمال کو آپ غدر اور انقلاب اور جنگ آزادی کی صورت بھی قرار دے سکتے ہیں۔

تشدد کا نشانہ یا ہدف (Target)

تشدد کا نشانہ، تشدد بپا کرنے والے کی اپنی ذات بھی ہو سکتی ہے۔ وہ خود کو بھی نشانہ بنا سکتا ہے جس کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ یہ انفرادی تشدد کے زمرے میں ہی آئے گا۔ انفرادی سطح پر تشدد کا نشانہ کوئی بھی دوسرا فرد کوئی عورت یا بچہ ہو سکتا ہے یا اجتماعی تشدد کی صورت میں کوئی فرد یا معاشرہ یا قوم بھی تشدد کا نشانہ بنائی جا سکتی ہے۔ اس لیے جب ہم تشدد کی نشان دہی کی طرف آتے ہیں تو ہمیں تشدد کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا پڑے گا۔ ان میں جنسی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی اور فرقہ وارانہ تمام عوامل شامل ہوں گے۔ اسی طرح ہر قسم کا تشدد برپا کیا جا سکتا ہے۔ جنگوں اور انقلابوں کے درمیان قومی سطح پر بعض اوقات جنسی تشدد سے کام لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ بوسنیا میں پچھلے دنوں پوری مسلم قوم کو جنسی تشدد کا بھی نشانہ بنایا گیا۔ عورتوں، بچوں اور مردوں میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا۔ جنسی درندگی کو بروئے کار لایا گیا۔ مشرقی بنگال میں بھی ایسے واقعات ۱۹۷۰ء میں رونما ہوئے۔

اسی طرح تشدد مذہبی فرقہ واریت کی وجہ سے بھی رونما ہو سکتا ہے۔ اس کا نشانہ

ایک فرد یا اقلیت یا فرقہ بھی ہوسکتا ہے اور پوری قوم بھی۔ اسی طرح تشدد سیاسی، معاشرتی اور تجارتی سطح پر بھی ہوسکتا ہے۔ قومیں جب ایک دوسرے پر معاشی اور تجارتی پابندیاں عائد کرتی ہیں تو ان کا نشانہ خاص قسم کے نقصانات پہنچانے کا ہوتا ہے۔ ''عراق'' پر اقتصادی پابندیاں بھی اسی زمرے میں آتی ہیں اور عراق میں کردوں پر جو بیت رہی ہے اس کی بھی کچھ ایسی ہی صورت حال ہے۔

تشدد کے ہتھیار اور وسائل (Tools of Violence)

تشدد دست بدست بھی ہوسکتا ہے۔ اس ہاتھ کر و اس ہاتھ ملے۔ یہ سودا دست بدستی ہے۔ پتھر مار کر بھی تشدد کیا جا سکتا ہے۔ خشت باری، سنگ باری بھی تشدد کے ہتھیار اور وسائل ہیں۔ تہذیبی اور تمدنی ترقی جس رفتار سے کسی معاشرے میں ہوتی ہے اسی سرعت کے ساتھ تشدد کے ہتھیاروں میں بھی اضافہ اور تبدیلی آتی جاتی ہے۔ تشدد کے ہتھیار عموماً وہی ہوتے ہیں جو کسی تہذیب میں مرنے مارنے اور جنگ و جدل برپا کرنے کے وسیلے ہوتے ہیں۔ سب سامان اور آلات حرب تشدد کے ہتھیار بن جاتے ہیں۔ ہینڈ گرنیڈ سے لے کر ٹینک شکن توپوں اور میزائلوں تک سب تشدد کے ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ بارودی سرنگیں تک تشدد میں استعمال ہونے لگی ہیں۔ زمانے کے مطابق تشدد کے ہتھیار تشکیل پاتے ہیں۔ پتھر کے زمانے میں پتھر، دھات کے زمانے میں دھات اور ایٹمی اور ریڈیائی دور میں ایٹم بم اور دو مار میزائل سب تشدد کے وسیلے کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ جنسی تشدد ہوگا تو آلات جنسی ہوں گے۔ نفسیاتی تشدد ہوگا تو ہتھیار بھی نفسیاتی اور جذباتی ہوں گے۔ خوف و ہراس پھیلانا۔ افواہوں کو استعمال کرنا۔ جھوٹی خبریں اور اسی طرح کے جھوٹے بیان اور تقاریر کا سہارا لینا نفسیاتی اور اعصابی جنگ کے ہتھیار بن جاتے ہیں اور مختلف قسم کے اطلاعاتی میڈیا کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر تشدد محض جسمانی اور بدنی سطح پر ہو گا تو جوڈو کراٹے سے لے کر تمام طور و اطوار کے ہتھیار اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اب تو تمام دنیا سمٹ کر ایک عالمگیر گاؤں یا دیہات کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ ظاہر ہے ہر قسم کے اسلحے کی دکان بھی یہاں موجود ہے۔ جو چاہیں اور جب چاہیں آپ دام دیں اور ہر قسم کا اسلحہ کھلی منڈی میں آزادی سے خریدیں۔ بیچنے والے چاہے

دس اور سے منگوائیں یا بڑے کی آڑ میں آپ تک کسی طریقے سے پہنچائیں۔ آپ کیش دینا چاہتے ہیں تو وہ بھی ممکن ہے اور اگر ہنڈی لکھ کر یا ڈالر کی شکل میں باہر ادا کرنا چاہتے ہیں تو وہ بھی حصہ بقدر حبثہ آپ سے سلوک روا رکھا جا سکتا ہے۔ ہاں آپ ہیروئن اور حشیش کی شکل میں بھی ادائیگی کر سکتے ہیں۔ جو مزاج یار میں آئے وہ منظور و مقبول۔ اسلحہ بیچنے والے اور اسلحہ خریدنے والوں کے درمیان کوئی باہمی معاہدہ یا عہد نامہ بھی طے پا سکتا ہے کہ وہ کون سی قومی اقدار اور مقاصد کی تجارت کرنے پر رضا مند ہیں۔ اس صورت میں باہمی رضا و رغبت سے ''بغیر دولت خرچ کیے آپ ملک وقوم کا سودا کر سکتے ہیں اور اسلحہ کی فروخت اور تشدد کا بازار گرم کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ایک تشدد کی بھیانک تصویر ہے جس کا چرچا ان دنوں ترقی پذیر تیسری دنیا کے ملکوں اور قوموں میں بہت عام ہے اور ہمارا ہمسایہ ملک ''افغانستان'' ایسے ملکوں کا امام ہے اب تو پاکستان میں بھی کچھ اسی طرح کا اہتمام ہے۔ اسلحے کی منڈیاں گھر گھر اور گلی گلی کھلی ہوئی ہیں۔ کروڑوں اور اربوں روپوں میں یہ کاروبار ہو رہا ہے۔ دنیا کے کونے کونے میں وہ بوسنیا ہو کہ چیچنیا، صومالیہ ہو کہ روانڈا اور برونڈی، آذر بائیجان ہو کہ قبرص۔ جنگ آزادی کے نام پر، نسل اور علاقے کا جھنڈا بلند کر کے مذہبی اور علاقائی نفرتوں کے زور پر جس طرح چاہیں آپ جنگ و جدل کا جھنڈا لہرائیں اور اسلحہ حاصل کر کے خون کی ندیاں بہائیں۔ قرون وسطیٰ سے بھی پہلے اور بعد تک اور پھر اب اس جدید دور میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ یورپ ہو کہ ایشیا، افریقہ ہو کہ امریکہ۔ ہر طرف آج بھی علاقائی نسلی اور مذہبی جنگیں جاری ہیں۔ غارت گری کا بازار گرم ہے۔ ''مذہب کے نام پر خون'' کی روایت جاری و ساری ہے۔ اسی طرح سے لسانی، نسلی، اقتصادی اور سیاسی تشدد بھی روز بروز ''ترقی پذیر'' ہے اور سب ''ترقی پذیر'' خطے اور ملک اس خون کی وادی میں سرگرداں ہیں۔ اخلاقی قدروں اور نیک مقاصد کے نام پر انسان کے بنیادی حقوق اور اعلیٰ اقدار اور روایات کا خون کیا جا رہا ہے۔ بہرحال یہاں ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ تشدد اور جرائم کا رشتہ کیا ہے۔ ہم نام کے تشدد کی حدود عبور کر کے باقاعدہ جرائم کی دنیا میں کہاں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان جرائم کے پیچھے جو بھی عوامل ہیں، جو بھی اسباب و اغراض ہیں، وہ فطری جذبے ہوں یا اخلاقی کمزوریاں کہ نفس کی منہ زوریاں یا پھر معاشی ضروریات یا معاشرتی مسائل بہرحال تشدد کا رشتہ دن بدن ''جرائم'' سے خاصا گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں بھی

ہمارے لیے سوچنے اور غور وفکر کا ایک مقام ہے۔

تشدد اور جرائم:

انفرادی سطح پر تشدد کی وارداتوں کے محرکات اور اسباب جو کچھ بھی ہوں ان میں سے اکثر واقعات اس رنگ میں تشدد کی سطح پر ہی شمار ہوتے ہیں کہ وہ باقاعدہ قانون میں زد میں آ کر جرائم کی حدود میں داخل نہیں ہو پاتے۔ مثلاً ایک خاوند اپنی بیوی پر روزانہ تشدد کرتا ہے کسی قدر مار پیٹ، گالی گلوچ اور دوسرے حقوق کی پامالی۔ اس رویے میں جسمانی تشدد کے ساتھ ذہنی، جذباتی اور معاشرتی تشدد بھی شامل ہوتے ہیں۔ بد زبانی، مار دھاڑ، پیسے چھین لینا، کما کر کچھ نہ لانا۔ بیوی بچوں کو فاقوں سے دو چار کرنا۔ اس طرح کی تشدد کی صورتوں میں وہ بے چاری ہر روز مبتلا کی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی شوہر کے ان مظالم کے باوجود اسے کسی قانونی گرفت میں لا کر باقاعدہ مجرم ثابت نہیں کیا جاتا۔ وہ قانونی گرفت میں نہیں آتا۔ بیوی بیچاری ظلم و تشدد کی ''آماجگاہ'' بنی رہتی ہے لیکن یہی تشدد، اذیت کوشی کی انتہا پار کر کے ایک دن یہ رنگ دکھاتا ہے۔ خاوند گلا گھونٹ کر بیوی کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اب یہ باقاعدہ جرم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ حالانکہ اسباب و وسائل اور اغراض و مقاصد اور جبلی تقاضے وہی پرانے تھے۔ کوئی نئی بات اس ''جرم'' کے ارتکاب کا موجب نہیں بنی۔ عموماً اس نہج پر تمام تشدد کے انفرادی واقعات جرائم کی حدود میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہاں اتنا کہہ دینا ہی کافی نہیں ہوگا۔ قانون کی حدود ہی تشدد اور جرم میں فرق کا باعث ہیں یا پھر وہ اخلاقی قیود جو معاشرہ اپنی روز مرہ کی زندگی میں بروئے کار لاتا ہے وہ تشدد اور ''جرم'' میں کسی حد تک تمیز پیدا کرتی ہے۔ لیکن تشدد کے اجزائے ترکیبی اور اس کی ہیئت میں کوئی ایسا امتیاز پیدا کرنا مشکل ہو جائے گا جس سے آپ اس کی معنوی تعریف کچھ اس طرح سے کریں کہ وہ جرائم سے بالکل الگ تھلگ پہچانا جا سکے۔ یا جرائم میں ایسا کوئی منفی وصف تلاش کیا جائے جو ان کو تشدد سے ممیّز کر سکے۔ ہر جرم میں تشدد کا پہلو ضرور ہوتا ہے اور تشدد میں جرم کا ارتکاب بھی ہوتا ہے۔ لیکن معاشرے کے وسائل کی کمی کی وجہ سے ہر ''تشدد'' کو ''جرم'' کی شکل میں قانون کی زد میں لایا نہیں جا سکتا۔

ترقی یافتہ ملکوں میں بہت سے ''تشدد'' جرم کا رخ اختیار کر لیتے ہیں اور قانون کی

زد میں آ جاتے ہیں لیکن پس ماندہ اور ترقی پذیر ملکوں میں قانونی وسائل کی کمی کی وجہ سے جب تک تشدد اپنی ''شدت'' کو اتنا نہ بڑھا لے کہ وہ کھلم کھلا جرم کے دائرہ میں شمار ہو جائے، تشدد محض تشدد ہی رہتا ہے اور اس پر قانون لاگو نہیں ہوتا۔

یورپ کے بعض ممالک اور امریکہ میں جرائم کے دائرے کو وسعت دے کے مختلف قسم کے تشدد مثلاً جنسی تشدد، عورتوں پر تشدد اور اسی طرح سے مختلف اقسام کے سماجی اور اقتصادی تشدد کو ملک کے تعزیراتی نظام اور قانون کی گرفت میں لانے کی تگ و دو کی گئی ہے لیکن ہمارے ہاں پس ماندہ اور ترقی پذیر ملکوں میں اکثر تشدد کے انفرادی واقعات سے اغماض ہی برتا جاتا ہے۔ اس لیے اس میں حیرت کی بات نہیں کہ ان ممالک میں روز بروز انفرادی سطح پر تشدد کی شرح بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ خاص طور پر جنسی تشدد اور عورتوں پر تشدد میں بے شمار اضافہ ہو رہا ہے جو ہم سب کے لیے تشویش کا باعث ہونا چاہئے۔

وہ جرائم جو اکثر کرمنل کوڈ (Criminal Code) یا ضابطہ فوجداری اور جرائم میں آتے ہیں انفرادی سطح پر تشدد کی فہرست سے ہم انہیں خارج ہی سمجھتے ہیں۔ مثلاً جب قتل ہو گیا تو وہ پھر قتل کی واردات کہلائے گا۔ ''تشدد'' کا نام ہم اسے نہیں دیں گے۔ لیکن اس گوئی سے وہ اگر مرا نہیں، محض زخمی ہوا ہے اور عمداً قتل کی کوشش کا اس پر قانونی الزام عائد نہیں کیا گیا تو وہ پھر تشدد کی واردات ہی کہلائے گا۔ اس تشدد کی اکثر وارداتیں جرائم پیشہ لوگوں کے ہاتھوں سے ہی سرزد ہوتی ہیں بلکہ وہ ایسے مشاق اور تجربہ کار لوگ ہوتے ہیں اور تشدد کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ قانون انہیں جرائم کے دائرے میں لے آنے سے قاصر ہے۔

ہم اس مطالعے میں اسی لیے تشدد اور جرائم کے اعداد و شمار میں بقاعدہ امتیاز برتنے سے قاصر رہیں گے کہ ہمارے ملک میں شماریات کے اداروں میں اول جرائم کی شماریات درج کرنے کی خاطر خواہ نظام سرے سے ہے ہی نہیں اور اگر کسی صوبائی یا مرکزی ادارے میں کچھ اعداد و شمار مل جاتے ہیں تو وہ ایف آئی آر کی بنا پر ملزموں اور مجرموں کے بارے میں ہی ہوتے ہیں اور وہ ان گنت واقعات و حادثات جو کہ جرم اور تشدد کے زمروں میں آتے ہیں ان کا ذکر وہاں ہوتا ہی نہیں۔ اس لیے شماریات کا شعبہ تشدد کے حوالے سے خاصا کمزور ہے۔ بلکہ بہت حد تک ناپید ہے۔ اس مطالعاتی جائزے میں جہاں تک ہوس

کے گا ہم کچھ اعداد و شمار بھی گاہے بگاہے پیش کریں گے۔ لیکن انہیں محض استدلال کی صورت واضح کرنے کے لیے پیش کیا جائے گا کوئی ثبوت مہیا کرنے کے لیے نہیں۔

اس باب کے آخر میں یہ مناسب ہو گا ہم اپنے مطالعے کے لیے فی الحال ایک ایسی فہرست مرتب کریں جس کی مدد سے ہمارے لیے تشدد کی بڑی اقسام کو شمار کرنا اور ان کی پہچان پیدا کرنا آسان ہو جائے۔ اس کے بعد ان میں سے زیادہ اہم نوعیت کے ''تشدد'' کو ہم اگلے ابواب میں زیرِ غور لا سکیں گے۔

تشدد کی مندرجہ ذیل اقسام تو بہرحال جانی پہچانی جاتی ہیں:

(1) جنسی تشدد
(2) عورتوں پر تشدد
(3) بچوں پر تشدد اور جبری روزگار
(4) انفرادی تشدد کے واقعات۔ مار پیٹ، لوٹ کھسوٹ، ہنگامہ آرائی، گالی گلوچ
(5) نسلی تشدد
(6) لسانی تشدد
(7) مذہبی اور فرقہ وارانہ تشدد
(8) سیاسی تشدد
(9) اقتصادی تشدد۔ حقہ پانی بند کرنا
(10) نفسیاتی تشدد
(11) تجراتی اور معاشی تشدد۔ تجارتی اور معاشی ناکہ بندیاں
(12) قانون نافذ کرنے والے اور امن و امان بحال کرنے والے اداروں کی طرف سے تشدد
(13) دہشت گردی اور تخریب کاری
(14) منظم اغوا اور لوٹ مار
(15) میڈیا میں تشدد کا رجحان۔ سخت اور نازیبا الفاظ اور اصطلاحات کا بے دریغ استعمال
(16) تیز رفتاری اور ٹریفک قوانین کو توڑنے کا رجحان
(17) شوروغل اور ٹی وی، ریڈیو کا غیر مناسب استعمال (صوتی تشدد)

(18) دھماکہ خیز مواد کا بے دریغ استعمال۔ شادیوں اور دوسری خوشی کی تقاریب میں

(19) اسلحہ کی نمائش دہشت پیدا کرنے کی غرض سے

(20) شادی بیاہ کی اور دیگر سماجی تقاریب اور دعوتوں میں نظام کو درہم برہم کر کے کھانے پینے اور دوسرے مقاصد کا حصول

(21) خودنمائی کا بے جا استعمال جو دوسروں کو ناگوار گزرے چاہے وہ گلی کوچے میں ہو یا مجلس اور کسی کلب میں ہو۔

مندرجہ بالا اقسام میں سے ''تشدد'' کی چند اہم قسموں کا ہم اگلے ابواب میں کسی قدر تفصیل سے ذکر کریں گے تاکہ تشدد کے تاریخی پس منظر کے ساتھ ہم تشدد کی مختلف نوع واقسام کا کسی حد تک مناسب جائزہ لے سکیں۔ تشدد کی موجودہ صورت حال جس سے ہم دو چار ہیں اس کا تجزیہ کرنا اسی وقت ممکن ہوگا جب ہم اپنے ملک کی پچاس سالہ تاریخ کو دھیان میں لاکر برصغیر کے تاریخی پس منظر میں تشدد کی مختلف اقسام کا مطالعہ کریں گے۔ پھر شاید ہم کچھ ایسے نتائج اخذ کرسکیں جن سے ہم موجودہ معروضی صورت حال سے نکل کر مستقبل کی امیدوں اوراندیشوں کا جائزہ لے سکیں اور شاید کچھ ایسے نکات پیش کرنے کے قابل ہوسکیں جن سے ہماری موجودہ مشکلات کا کوئی حل پیش کیا جا سکے۔ اس طرح ہماری قومی زندگی میں شاید خوش آئند تبدیلیوں کے امکانات پیدا ہوسکیں۔

انفرادی تشدد کے چند اہم پہلو اور اقسام

فرد اور معاشرہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ افراد کا دوسرا نام ''معاشرہ'' ہے۔ انسان کی فطری جبلت اسے ایک فرد کی حیثیت سے دوسروں پر انحصار کرنے کا پابند بناتی ہے۔ انسان کو اسی لیے ''سماجی جانور'' کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ شاید تمام حیوانوں اور جانوروں سے زیادہ انسان کو کسی نہ کسی طرح معاشرے اور سماج کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا اپنے خاندان اور ماں باپ پر زیادہ دیر انحصار رہتا ہے۔ اسی طرح بچپن کے بعد عہد شباب اور پیری کے دور بھی معاشرتی سہاروں اور امداد کے مرہون منت ہوتے ہیں۔

انسان کے معاشرتی رشتوں کی ابتدا خاندان کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی سے ہوتی ہے اور پھر معاشرے کی بڑی اکائیوں یعنی گروہ، قبیلے، قوم، نسل اور طون کے دائروں میں افراد اپنی اپنی قابلیت اور موقعوں کے مطابق منسلک ہوتے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ ان کے رسم ورواج اور اقدار کے پابند ہوتے جاتے ہیں۔

لیکن تشدد کے بارے میں جب ہم اس کی مختلف نوعی صورتوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم پر آشکار ہوتا ہے کہ تشدد کے بعض بنیادی پہلو انفرادی سطح پر زیادہ کھل کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً فرد پر سب سے پہلے ''تشدد'' اس کے گھرانے یا خاندان سے شروع ہوتا ہے۔ چاہے وہ میاں بیوی کے معاملات ہوں یا ماں باپ کے مسائل ہوں یا بچوں کی پرورش اور نگہداشت کا مسئلہ ''تشدد'' بنیادی طور پر اسی انفرادی سطح سے جنم لیتا ہے۔ انفرادی تشدد کیچاہے کوئی بھی نوعیت ہو یعنی وہ جنسی تشدد ہو کہ عورتوں اور بچوں پر تشدد اور ان کے حقوق کی پامالی ہو۔ وہ شروع انفرادی سطح پر ہی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بچوں کو ہی لیں۔ بچوں کو مارنا پیٹنا، بے توجہ، ان کی ضروری نگہداشت نہ کرنا۔ صحت اور خوراک کی زبوں حالی۔ بچوں سے زبردستی بیگار لینا۔ ان کو جبری ملازمت دلوانا۔ محنت مزدوری کا کام لینا۔ یہ سب انفرادی تشدد میں ہی شمار ہوں گے۔ ان حالات کے پیش نظر بچے اکثر گھروں سے بھاگ جاتے

ہیں اور پھر مختلف اقسام کے تشدد کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر ہم اس پہلو سے انفرادی تشدد پر غور کریں تو ہمیں یہ محسوس ہوگا کہ ان واقعات اور واردات کو چھوڑ کر جو فرداً فرداً معاشرے میں رونما ہوتی ہیں انفرادی تشدد کے تین اہم پہلو ہیں جن کی طرف ہمیں اپنے مطالعے کا رخ موڑنا پڑے گا۔ وہ ہیں:

(1) جنسی تشدد

(2) عورتوں پر تشدد

(3) اور بچوں پر تشدد

اس باب میں افراد اور خاندان کے حوالے سے مندرجہ بالا اقسام کا اس طرح تجزیہ پیش کریں گے کہ آپ کے سامنے نفسیاتی، معاشرتی اور تاریخی سطح پر علم و ادب اور ثقافت کے حوالوں سے ایسا مواد پیش کیا جائے جس سے آپ خود اندازہ لگا سکیں کہ جنسی تشدد، عورت کی زبوں حالی اور بچوں کی کسمپرسی کی کہانی کتنی پرانی ہے۔ اس میں انسانی نفسیات، تاریخ، قدیم ساطیر اور دیو مالائیں ہمیں کیا کچھ بتاتی ہیں۔ آیا انسان کے قدیم و جدید تہذیبی ادوار میں جنسی تشدد میں کچھ تبدیلیاں آئی ہیں یا اس کی نوعیت کم وبیش وہی رہی ہے۔ اسی طرح کیا عورتوں پر تشدد کی کہانی کی تاریخ دہرائی جا رہی ہے یا اب اس میں کوئی ردوبدل ہو رہا ہے؟ بچوں پر تشدد کی کہانی کتنی پرانی ہے۔ انسان کی جدید دور میں بچوں پر تشدد میں کیوں اس قدر اضافہ ہوا کہ انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ تعلیم اور ثقافت میں ترقی کے باوجود اور صحت اور خوراک کی بہتر سہولتوں کے ہوتے ہوئے بھی بچوں پر تشدد کا ایک سیلاب امنڈ آیا ہے۔

سب سے پہلے جنسی تشدد کے بارے میں ہم غور کریں گے۔ کیونکہ اسی تشدد سے دراصل عورتوں اور بچوں پر تشدد کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔

جنسی تشدد:

جنسی یا شہوانی طبعی تقاضے انسان کی وہ جبلت ہیں جس کو جدید نفسیات کے اکثر مدرسہ ہائے فکر نے انسانی فطرت اور کردار کی نشوونما کے لیے ''محور'' قرار دیا ہے۔ جنسی تشدد

کا نشانہ عموماً ایک فرد ہوتا ہے اور یہ فرد اکثر عورت یا لڑکی ہی ہوتی ہے۔ گو بعض اوقات ایک مرد یا لڑکا بچہ بھی ہو سکتا ہے۔ جدید نفسیات نے جنس کی نشوونما اور اس کے زیر و بم کے مختلف عوامل کو بچپن کے دور سے ہی وابستہ کیا ہے جس سے ہر فرد کو ایک خاص ماحول سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس ماحول کے مطابق اس کی جنسی تعلیم و تربیت ہوتی ہے اور جنس کے بارے میں اس کا کردار ترتیب پاتا ہے۔ طبعی تقاضوں کی افراد اور تفریط کو بھی آپ اس میں شامل ضرور کریں گے تاکہ کسی فرد کی جنسی زندگی میں اس کے عمل اور ردعمل کا صحیح طور پر آپ محاسبہ کر سکیں۔ ''جنسی تشدد'' کو اکثر ماہرین نفسیات ذہنی اور جذباتی سطح پر کسی نفسیاتی بیماری کا باعث قرار دیں گے۔ ''جنسی تشدد'' دوسرے تشدد کی اقسام کی طرح ''غیر متوازن'' اور بے جا شدت عمل کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ یہ غیر متوازن، غیر موزوں شدت عمل کیوں ظہور پذیر ہوتی ہے؟ اس میں جبلی تقاضے کی زیادتی بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے اور دوسری طرف کسی جبلی کمزوری کے ردعمل کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے۔ جنسی نااہلی بھی تشدد کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لیے کسی حد تک ''جنس'' کے بارے میں ہمارے پاس کچھ معلومات کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً جنس کے لیے تحلیل نفسی کی بنیادی اصطلاح ''ایروس'' (Eros) ہے۔ یعنی شہوانی جذبہ! ایروس ایک رومن دیوتا ہے۔ جیسا کہ ہندومت کی دیو مالا میں ''کام دیوتا'' ہے! ایروس دیوتا اور وینس دیوی کے ملاپ سے ''کیوپڈ'' دیوتا پیدا ہوا جس کو محبت اور عشق کا کھلنڈرا اور شریر بچہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا مشغلہ محبت کی تیر اندازی ہے۔ جسے چاہے وہ اپنے تیروں کی ناگہانی نشانہ بنا سکتا ہے۔ اس کا مشغلہ یہی ہے کہ وہ اپنے تیروں سے جسے چاہے کھیل ہی کھیل میں تشدد کا نشانہ بنا لے۔ تیر اور تشدد کا رشتہ اور پھر تشدد کا نشانہ۔ یہ اساطیری تصویر ہے جس سے ''جنسی تشدد'' کی طرف علاماتی انداز سے اشارہ کیا جا رہا ہے۔ محبت اندھی ہوتی ہے اس لیے جنس کا جواز خود جنس ہے اور جنسی تشدد، شدت اظہار کا ذریعہ ہے۔ آپ ذہنی اور نفسیاتی طور پر جو کوئی بھی توجیہہ کریں گے بات یہاں تک ہی پہنچے گی کہ جنسی بے راہ روی اور غیر متوازن جبلی تسکین ہی جنسی تشدد کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے اور یہی اس کی بنیادی وجہ بھی ہوتی ہے۔ ''کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا''۔ یہاں عشق سے مراد کیا ہے؟ جنسی تشدد کے معاملے میں دماغی خلل اور نفسیاتی الجھاؤ اور اس کے عمل کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ جنسی تسکین تو انسان کی تخلیقی قوا کی پرورش میں مرکزی کردار ادا کرتی

ہے اور انسان کو صحت مند رویوں سے روشناس کراتی ہے۔ جنسی تشدد کا ظہور پذیر ہونا اس بات کی نشانی ہے کہ کہیں تخلیقی قوت تخریبی قوت میں تبدیل ہوئی ہے اور یہ تبدیلی کا عمل کسی اور نفسیاتی الجھن یا بیماری کی وجہ سے رونما ہوا ہے۔ ذہنی اور جذباتی ہیجان کا اس طرح پیدا ہونا کہ وہ جنسی تشدد پر کسی فرد کو اکسائے۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں لیکن جنس کا یہ تخریبی پہلو ہندومت کی دیو مالا بھی خاصا آشکار ہے۔ مثلاً شو دیوتا۔ جنسی طاقت کا دیوتا بھی کہلاتا ہے۔ شو (Sihv) دیوتا دراصل مردانہ جنسی صفات کا مظہر ہے۔ مردانہ جنسی صفت ہی تخریب کا پہلو ہے اور وہ ہے وار کرنا۔ در آنا۔ وہ تیر کی شکل میں ہو یا تلوار کی شکل میں یا برچھے بھالے کی صورت میں۔ شو دیوتا اس لیے ہندو دھرم میں ایک سطح پر تباہی، بربادی اور تخریب کا مظہر ہے۔ یعنی جنسی جبلت کا مردانہ اظہار دراصل تباہی اور بربادی کے روپ میں ہی ہو سکتا ہے۔ اب آپ دیکھیں ایک طرف شو دیوتا ہے جو بربادی کی علامت ہے اور دوسری طرف وشنو دیوتا ہے جو زندگی اور آبادی کی علامت ہے اور ہر قسم کی پیدائش اور پرورش کا کام برہما دیوتا کی ذمہ داری ہے۔ یہاں شو دیوتا ایک رنگ میں نفس امارہ کا ہی دوسرا روپ ہے جو ہمیں برائی کی طرف اکساتا ہے۔ برائی اور بربادی کی طرف۔ حیوانی صفات کی طرف، جنگل کی زندگی کی طرف۔ یعنی تشدد اور ظلم کی طرف چاہے یہ تشدد اور ظلم اپنے نفس پر ہو یا کسی دوسرے فرد پر ہو۔ لیکن ''تشدد'' ایک مردانہ صفت کے طور پر ابھرتا ہے اور اسی لیے جنسی تشدد کا نشانہ اکثر مادہ یا عورت ہی ہوتی ہے۔ بہت کم مثالیں ہیں جہاں عورت نے مرد کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا ہو اور وہ مثالیں اس بات کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں کہ عورت میں جب ''اینی ما'' اور ''اینی مس'' یعنی مردانہ اور زنانہ خواص میں کمی بیشی ہوتی ہے تو وہ عورت اپنے مردانہ خواص کے بل بوتے پر ''مردانہ تشدد'' کا اظہار کرتی ہے کیونکہ اس کا اپنا ''نسوانی بہتر حصہ'' ماؤف ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ عمل اور ردعمل اس قدر الجھاؤ پیدا کرتے ہیں کہ ان کے نتائج کا محاسبہ اتنا آسان نہیں۔ لیکن ''جنسی تشدد'' کا محور مردانہ صفت یعنی وار کرنا، شکار کرنا، دوسروں کے ''علاقے'' میں گھسنا۔ یہ سب علامتیں شامل ہیں۔ اب رہا یہ ہوتے ہیں اور بعض اوقات سماجی اور ہنگامی بھی۔ انفرادی ''جنسی تشدد'' میں عموماً ذہنی اور جذباتی ناآسودگی، بیماری یا غیر متوازن رویہ اور شدت ضرور نمایاں ہوتے ہیں۔ محبت میں ناکامی مایوسی۔ محبت کسی سے کی ناکامی وہاں ہوئی اور جنسی تشدد ک نشانہ دوسرے بن رہے ہیں۔

''مار'' یا ''مات'' کسی اور سے کھائی اور غصہ کسی اور پر نکال رہے ہیں۔ جنسی تشدد کے دائرہ کار میں صرف براہ راست جنسی تشدد کے واقعات ہی نہیں آئیں گے، بلکہ جنس، محبت اور عشق کی ناکامیاں اور نامرادیاں ہر قسم کے جنسی تشدد کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ شیکسپیئر کے اوتھیلو (Othello) سے لیکر ہیلن آف ٹرائے، ہیر رانجھا کی داستان اور پھر ٹالسٹائی کی اینا کرینینا سے لے کر ڈی ایچ لارنس کے ناولوں تک سب کردار کسی نہ کسی طرح ''جنسی تشدد'' کے مختلف مظاہر پیش کرتے ہیں۔ جنس کے حوالے سے جو تشدد منظر عام پر آئے گا وہ جنسی تشدد ہی کہلائے گا۔

اس میں وہ معاشرے بھی شامل ہیں جہاں جنسی تعلقات پر نگہبانی اور نگرانی حد سے زیادہ ہوتی ہے۔ جو معاشرہ سختی کی طرف مائل ہے وہاں بھی جنسی تشدد ہوتا ہے۔ اس کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ تعداد ازدواج میں ناجائز اور بے ضرورت اضافہ اور اسی طرح کی دوسری ذہنی اور جذباتی بیماریاں بھی اس میں شامل ہیں۔ اس میں وہ معاشرے بھی شامل ہیں جن کے ہاں جنسی بے راہ روی اور آزادی حد سے بڑھ گئی ہے۔ بے حجابی اور بے حیائی اس حد تک عام ہوگئی ہے کہ ہر روز نت نئے ''جنسی تشدد'' کے مظاہر تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ جنسی تشدد کی شرح ان ممالک اور قوموں میں کمی نہیں ہوتی بلکہ بہت بڑھ گئی ہے۔ انسانی نفسیات میں تسکین اور ٹھنڈک اور قوموں میں کم نہیں ہوتی بلکہ بہت بڑھ گئی ہے۔ انسانی نفسیات میں تسکین اور ٹھنڈک کا پہلو آج بھی ان معاشروں میں ظہور پذیر نہیں ہوا۔ بلکہ ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔'' مریض عشق کے مقدر میں شاید یہی کچھ ہے۔ لیکن یہاں یہ ضرور یاد رکھیں کہ مریض عشق عموماً مردانہ صفات کا ''حامل'' ہوتا ہے۔ جس کا کام ''ٹریس پاسنگ'' (Tress passing) خلل انداز ہونا۔ حدوں سے باہر آنا۔ دوسروں کے کھیتوں اور ''کھیتیوں'' پر نظر رکھنا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ معاشرہ مشرقی ہو کہ مغربی شمالی ہو کہ جنوبی خواہ آبادی کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے کہ کمی ہو رہی ہے۔ لیکن ''جنسی تشدد'' کے اعداد وشمار میں بری طرح اضافہ ہر ملک اور قوم میں ہو رہا ہے۔ وہ پڑھی لکھی قوم ہے یا ان پڑھ۔ ترقی یافتہ ہے یا ترقی پذیر ''جنسی تشدد'' بے قابو ہی تھا اور اب بھی بے قابو ہے اور شاید یہ حال اسی طرح قائم رہے گا جب تک ہم اپنے معاشروں میں مرد اور عورت کی نفسیات کے بارے میں از سرنو

غور کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ محبت کے کچھ پہلو نسائی ہیں اور محبت اور جنس کے کچھ پہلو مردانہ ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کی طرف متوجہ ہو کر جب تک ہم محبت کے نسائی پہلو کی حرمت، عزت اور احترام اور ان کے استحکام کی خاطر خواہ صورت اور فضا نہیں پیدا کریں گے، اس بظاہر ''مردانہ معاشرے'' میں جنسی تشدد پر قابو پانا ہرگز آسان نہیں ہو گا بلکہ دن بدن دشوار ہوتا جائے گا۔ جنس کا جذبہ اور تقاضہ بقائے انسانی کا محور ہے۔ چکی یونہی چلتی رہے گی اور آٹے کے ساتھ گھن بھی یونہی پستا جائے گا۔

جنسی تشدد کے متفرق واقعات آپ کے سامنے اگلے صفحات میں کچھ ایسے انداز میں پیش کیے جا رہے ہیں جو بظاہر آپ کو انوکھا بھی لگے گا اور کچھ بے ربط اور بے ترتیب بھی۔ لیکن اس کا مقصد آپ کے سامنے ایک بے سمت لیکن جامع، ذہنی اور جذباتی منظر نامہ پیش کرنا ہے۔ جس سے آپ جنسی تشدد کے واقعات کا جائزہ لے سکیں۔ نفسیات میں اس ٹیکنیک کو ''Thematic Apperception'' کہتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ ایسا تناظر پیش کیا جائے جس سے ساری بات شعور اور لاشعور پر اجاگر ہو جائے لیکن کسی خاص نقطہ نگاہ کو قاری پر ٹھونسا نہ جائے۔ وہ خود اپنا تاثر قائم کرے اور نتائج اخذ کرے۔ مندرجہ ذیل تمام واقعات ہم نے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے سرکاری ترجمانی ''جہد حق'' سے لیے ہیں یا پھر اسی ادارے کی سالانہ رپورٹوں پر انحصار کیا ہے۔

راجن پور

قصبہ شکار پور کی ۱۷ سالہ شادی شدہ خاتون عشرت امبر نے اپنی پریس کانفرنس میں کہا کہ ایک سال قبل اس کی شادی شاہ علی نامی شخص سے ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد وہ اپنے والدین سے ملنے آئی تو اسے اللہ رکھا، نیک محمد، محمد الیاس اور محمد صادق نے اغواء کر لیا جو اسے ڈھائی ماہ تک مختلف علاقوں میں لیے پھرتے رہے اور اس کے ساتھ جنسی تشدد کرتے رہے۔ ایک بار اسے وکیل کے پاس لایا گیا تو اس نے بھی اس کے ساتھ زیادتی کی۔ پرچہ درج ہونے کے بعد جب اسے جیل بھیجا گیا تو سپرنٹنڈنٹ جیل اسے اپنے دفتر میں منگوا کر اس کے ساتھ جنسی تشدد کرتا رہا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل چوہدری نذیر احمد اور حوالدار محمد اقبال نے بھی اس کے ساتھ جنسی تشدد کیا۔ مزاحمت کرنے پر اسے زدوکوب کیا جاتا اور اس کے

ہاتھوں کو داغا جاتا۔

''جہد حق'' جولائی ۷، ۱۹۹۶۔ صفحہ ۱۴ اور ۱۵

خیبر ایجنسی............''ہسپتال میں جنسی تشدد''

ایجنسی ہسپتال ہیڈ کوارٹر لنڈی کوتل میں عظیم آفریدی نامی ایک ڈاکٹر حال ہی میں ایک افغان مہاجر خاتون کے ساتھ جنسی تشدد کرتے ہوئے پکڑا گیا۔

''جہد حق'' ۷ جولائی ۱۹۹۶ء۔ صفحہ ۱۵

کوہلی لڑکیوں پر تشدد

تعلقہ ٹنڈو اللہ یار میں کوہلی قبیلہ کی دو لڑکیوں ۱۸ سالہ رادھا اور ۱۵ سالہ ہوسی پر جنسی تشدد کے واقعہ میں ملوث ملزمان کو ٹنڈو اللہ یار پولیس نے تفتیش کے دوران رہا کر دیا۔

متاثرہ قبیلہ کی درخواست پر اس معاملہ کی ایک مرتبہ پھر تفتیش کرائی گئی جس کے نتیجے میں ملزمان کی دوبارہ گرفتاری عمل میں آئی اور اس بات کا انکشاف ہوا کہ پولیس نے تفتیش کے دوران ملزمان کو فائدہ پہنچانے کے لیے کوشش کی تھی لیکن انسپکٹر جنرل آف پولیس سندھ نے ٹنڈو اللہ یار کے بعض پولیس اہلکاروں کی غیر ذمہ دارانہ فعل کی شکایت پر ان کے خلاف کارروائی کا حکم دیا ہے۔

HRCP کے کارکن مسٹر شاہد مشتاق کو اس واقعہ کے سلسلے میں ہونے والی ملاقات کے دوران آئی جی سندھ کی طرف سے نامزد کردہ تحقیقاتی ٹیم کے افسران نے بتایا کہ تفتیش میں کسی قسم کی کوئی جانبداری نہیں برتی جائے گی اور واقعہ کی تحقیقات کے بعد ملزمان کو قرار واقعی سزا دی جائے گی۔

مسعود احمد بزمی

پشاور............۶ سالہ بچی جنسی تشدد کے بعد قتل

پشاور سے ۶ کلومیٹر دور گاؤں خزانہ پایاں میں ۶ سالہ بچی ثمینہ لاپتہ ہو گئی تھی۔ ۳ ہفتہ تلاش بسیار کے بعد ورثاء نے ایک شخص کو مشکوک حرکات کے باعث پکڑ کر پولیس کے

حوالے کر دیا۔ ۶۱ سالہ ملزم عبدالمجید ایک ویران جگہ پر رو رہا تھا اور توبہ کر رہا تھا۔ ملزم کے اعتراف اور نشاندہی کے بعد بچی کی لاش مل گئی۔ ملزم نے بتایا کہ وہ ٹافیاں دے کر بچی کو ڈیرے میں لے گیا۔ جنسی تشدد کیا اور پکڑے جانے کے خوف کی وجہ سے بچی کو قتل کر کے گڑھے میں دفنا دیا۔ مجسٹریٹ نے ملزم کو جوڈیشل حوالات پشاور جیل میں بھیج دیا ہے۔

علی پور............جنسی تشدد کے بعد شاگرد کو قتل کر دیا

۱۳ سالہ طالب حسین نے دینی مدرسہ مظہر العلوم میں اپنے استاد مولوی اصغر کے کردار کی وجہ سے اس کے پاس پڑھنے سے انکار کر دیا تو اس کے والدین نے اسے مدرسہ مولوی نور محمد داخل کرا دیا۔ کچھ عرصہ بعد مولوی محمد اصغر کی اتفاقاً اپنے پرانے شاگرد طالب حسین سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ موضع بستی عارف لے گیا۔ مولوی اصغر کو شبہ تھا کہ طالب حسین دوسرے مدرسے میں جا کر اسے بدنام کر رہا ہے لہٰذا اس نے اسے ختم کرنے کا پروگرام بنایا۔ ایک ویران جگہ جا کر اس نے اپنی کمر سے بندھی ہوئی رسی اور تار سے طالب حسین کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس پر جنسی تشدد کیا اور پھر رومال کا پھندہ ڈال کر اس کا گلا گھونٹ دیا۔

پولیس نے دو ماہ بعد مولوی اصغر کی نشاندہی پر ویرانے سے طالب حسین کی لاش کے بچے کھچے اجزاء اور ہڈیاں برآمد کر لی ہیں۔

پولیس کی حراست میں اقبال جرم کے بعد مولوی اصغر حسین نے اس بہیمانہ واردات کی تفصیل راقم الحروف کو سنائی۔

ڈاکٹر عاشق بھٹی

پولیس حوالات میں ۸۰ فیصد عورتوں پر جنسی تشدد کیا جاتا ہے۔

اگرچہ زنا بالجبر کثرت سے کیا جا رہا ہے اس کے باوجود عوام نے اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ زنا بالجبر نہ صرف ایسا جرم ہے جس کی پولیس میں بہت کم رپورٹ لکھوائی جاتی ہے بلکہ اس کے مرتکب افراد کو سزا ملنے کی شرح بھی سب سے کم ہے۔ زنا بالجبر کے مقدمے کی سماعت کے دوران میں مظلوم عورت کے کردار پر کیچڑ اچھالی جاتی ہے۔ شاید زنا بالجبر ہی وہ واحد جرم ہے جس میں مظلوم کو خود اپنی بے گناہی ثابت کرنی پڑتی ہے اور ہمارا معاشرہ

جنسی جرائم کے ذکر کی اجازت نہیں دیتا اور عام طور پر لوگ اس بارے میں خاموش رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی مظلوم عورت انصاف حاصل کرنا چاہے تو اسے معاشرے کے غیض وغضب کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔

محرم عورتوں اور بچیوں کے ساتھ زنا بالجبر

پچھلے کچھ برسوں میں عورتوں پر تشدد کے کئی واقعات کے بارے میں جو خبریں شائع ہوتی رہی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کے خلاف جنسی جرائم بڑھتے جا رہے ہیں نیز محرمات سے زنا بالجبر کے واقعات بھی پیش آئے ہیں۔

۱۹۸۵ء میں وہاڑی میں ایک آٹھ سالہ بچی انجم نورین کو اس کے والد نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ مظلوم بچی کی والدہ وفات پا چکی تھی اس لیے انجم نورین نے یہ بات اپنے بھائی کو بتائی۔ بھائی نے اسے اپنے ماموں سے بات کرنے کے لیے کہا۔ انجم نورین کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے ماموں نے ایف آئی آر درج کرا دی۔ اس اثناء میں بچوں کا والد فرار ہو گیا۔ طبی رپورٹوں سے بچی کے الزامات درست ثابت ہوئے۔ عدالت نے ملزم کو سزا سنا دی لیکن اپیل پر مقدمے کی سماعت کا دوبارہ حکم دے دیا گیا۔ اس دوران میں انجم اور اس کے بھائی کو ایس او ایس ولیج لاہور میں رکھا گیا۔ ہر قسم کے دباؤ کے باوجود بچوں نے اپنے باپ کے خلاف گواہی دی۔

مقدمے کی دوبارہ سماعت کے ملزم کو دوبارہ سزا سنا دی گئی۔ تاہم وفاقی شرعی عدالت میں اپیل کے بعد ملزم کو بری کر دیا گیا۔ عدالت نے کہا ہو سکتا ہے کہ لڑکی کے ننھیال والوں نے اپنے الزامات کے ثبوت میں طبی رپورٹیں حاصل کرنے کے لیے بچی کو خود زخمی کیا ہو۔ عدالت کے خیال بھی نہ آیا کہ اگر کسی نے جان بوجھ کر بچی کو زخمی کیا ہوتا تو بچی اس کے حق میں کیوں گواہی دیتی۔ عدالت کو یہ ماننے میں زبردست تامل تھا کہ ہمارے معاشرے میں بھی اس طرح کا واقعہ ہو سکتا ہے۔ عدالت نے ملزم کو بری کرتے ہوئے دو معصوم بچوں کو ظالم باپ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ لے جا کر اچھی طرح سزا دے سکے۔ نوری اور اس کا بھائی اب بھی ایس او ایس ولیج میں رہ رہے ہیں۔ وہ خوف زدہ ہیں کہ ایک نہ ایک دن ان کا باپ انہیں لے جائے گا۔ انجم نورین کیس کی طرح کے عدالتی

فیصلوں سے ملزم کو سزا دینے کی بجائے خود مظلوموں کی زندگی خطرے میں ڈال دی جاتی ہے۔

پولیس حراست میں زنا بالجبر

پاکستان پولیس کی حراست میں زنا بالجبر کے واقعات عام ہیں۔ جب سے حدود آرڈی نینس جاری ہوا ہے اور زنا کو قابل سزا جرم قرار دیا گیا ہے پولیس روانہ سینکڑوں خواتین کو پکڑ کر تھانے لے جاتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ حوالات میں تقریباً ۸۰ فیصد عورتوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ خاتون قیدیوں پر تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ زیادہ تر عورتیں یہ ماننے سے انکار کر دیتی ہیں کہ انہیں جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ جہاں خواتین نے پولیس حراست میں زنا بالجبر کی شکایت بھی کی تو انہیں اپنی پریشانیوں میں اضافہ کے سوا کچھ نہ ملا۔

مختار بی بی کو اس کی سوتیلی والدہ کی رپورٹ پر پولیس پکڑ کر لے گئی۔ اس پر اپنے چچا زاد کے ساتھ بھاگ جانے کا الزام تھا۔ درحقیقت مختار بی بی نے اپنی گرفتاری سے چند روز قبل اپنی سوتیلی والدہ کی مرضی کے خلاف اپنے چچا زاد سے شادی کر لی تھی۔ پہلے مختار بی بی پر پولیس نے دباؤ ڈالا کہ وہ یہ بیان دے کہ اس کے چچا زاد نے نکاح نامے پر اس سے زبردستی دستخط کروائے ہیں اور یہ کہ اسے اغوا کر لیا گیا تھا۔ جب مختار بی بی نے انکار کر دیا تو یک پولیس والے نے اس سے دست درازی کی۔ اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اس نے مجسٹریٹ کے سامنے پولیس کی بتائی ہوئی کہانی بیان نہ کی تو اس کی عزت لوٹ لی جائے گی۔ پولیس والے رات بھر مختار بی بی کو پریشان کرتے رہے۔ اگلی صبح مختار بی بی کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ عدالت میں بیٹھے ہوئے پولیس والے ایک موقع پر اسے دیکھ کر ہنسے۔ مختار بی بی کا جی چاہا کہ پولیس والوں کی پیٹی سے پستول نکال کر اس کا خاتمہ کر دے لیکن اس نے کبھی پستول نہیں چلایا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کا نشانہ خطا ہو جائے گا۔ مختار بی بی نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے مجسٹریٹ کے سامنے ذہنی توازن کھو دینے کا کامیاب ڈرامہ کیا جس پر اسے ''دارالامان'' لاہور بھجوانے کے احکامات جاری کر دیئے گئے۔ مختار بی بی کو معلوم نہ تھا کہ اسے شیخوپورہ سے لاہور تک اسی پولیس والے کے ساتھ سفر کرنا پڑے گا۔

لاہور تک چار گھنٹے کے سفر میں اسے پولیس وین میں زنا بالجبر کا نشانہ بنایا گیا۔ مختار بی بی نے اپنے وکیل کو یہ بات بتائی رشتہ داروں کو نہیں کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اسے طلاق ہو جائے گی اور اس کے گھر والے اس سے ملنا چھوڑ دیں گے۔ اگلی سماعت پر مختار بی بی کا محافظ تبدیل کر دیا گیا۔ اس بار شیخوپورہ جاتے ہوئے زنانہ پولیس کے علاوہ ایک نیا مرد کانسٹیبل بھی تھا۔ وکیل پولیس گاڑی کے پیچھے آ رہے تھے۔ نئے کانسٹیبل نے ویگن کے پردے گرا کر مختار کی قمیص کے اندر ہاتھ ڈالا اور اس سے دست درازی کی۔ وکیل بے بسی سے یہ سب دیکھتے رہے۔

۴۰ سالہ احمدی بیگم اور دو دوسری عورتوں کو نواں کوٹ پولیس لاہور نے اپنی حراست میں لے لیا۔ دونوں نوجوان عورتوں کو کئی مردوں نے زنا بالجبر کا نشانہ بنایا اور احمدی بیگم کے جسم کے اندر مختلف چیزیں ٹھونسی گئیں۔ احمدی بیگم جب اپنی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرتی تو اسے زبردستی اپنی ساتھیوں کو کئی پولیس والوں کے ساتھ زنا بالجبر کا نشانہ بنتے دیکھنے پر مجبور کیا جاتا۔

اگلی صبح پولیس نے تینوں کے خلاف زنا کا مقدمہ درج کر لیا۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ ایک قحبہ خانہ چلا رہی تھیں پھر ان خواتین کو کوٹ لکھپت جیل، لاہور بھیج دیا گیا۔ ان کے جسموں پر زخموں کے کئی نشان تھے، ان کے جسموں سے خون بہہ رہا تھا اور وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھیں۔ جیل کے دورے پر آئے ہوئے ایک افسر نے عورتوں کی یہ حالت دیکھی تو اسے ان پر گزرنے والی قیامت خیز رات کا علم ہوا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے انتظامیہ کو اطلاع دی اور اسسٹنٹ کمشنر لاہور نے تحقیقات شروع کر دیں چونکہ کوٹ لکھپت جیل میں کوئی خاتون ڈاکٹر نہیں ہے اس لیے وقت پر عورتوں کا طبی معائنہ نہیں کرایا جا سکا۔ خاتون جیل سپرنٹنڈنٹ نے گواہی دی کہ عورتوں کے جسموں سے خون بہہ رہا تھا اور ان کی ٹانگوں اور پشت پر خراشوں کے کئی نشانات تھے۔ واقعہ کے دس روز بعد جب ان کا طبی معائنہ کرایا گیا تب بھی زخم پوری طرح مندمل نہیں ہوئے تھے۔ تحقیقات پر اسسٹنٹ کمشنر نے رپورٹ دی کہ عورتوں کو بے رحمانہ طریقے سے اجتماعی آبروریزی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ہائی کورٹ نے ملزم پولیس والوں کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے کا حکم دیا۔ تاہم پولیس والے ضمانتیں کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کا تبادلہ کر دیا گیا بعد میں وہ سب بری ہو

گئے۔ اس دوران میں احمدی اور اس کی ساتھیوں کو زنا کے مقدمے میں اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے میں تین سال لگ گئے۔ پولیس والوں کے خلاف قانونی کارروائی کے لیے مقدمے کی سماعت کے دوران تینوں عورتوں میں سے ایک بھی استغاثہ دائر کرنے پر تیار نہیں تھی۔ متاثرین کو عدالت میں سماعت کے لیے پیش نہ کیا گیا۔ کیونکہ پولیس والے معاملہ ختم کرانے کے لیے برابر دھمکیاں دے رہے تھے۔ آخر میں انصاف ملنے کی امیدیں دم توڑ گئیں انہوں نے اسی پر صبر کر لیا کہ انہیں زنا کے جھوٹے مقدمے میں سزا نہیں ملی۔

بیوی سے زنا بالجبر

بیوی کے ساتھ زنا بالجبر کو پاکستان میں جرم نہیں سمجھا جاتا۔ ۱۹۷۹ء میں زنا آرڈی نینس کے اطلاق کے بعد بیوی سے زنا بالجبر کی سزا کو ختم کر دیا گیا ہے۔

پاکستان میں یہ طریقہ عام ہے کہ نکاح ہو جاتا ہے اور رخصتی کافی عرصے بعد کی جاتی ہے۔ ۱۳سالہ بینا کی شادی محمد جبار سے ہوئی۔ شادی کے بعد دونوں خاندانوں میں جھگڑا ہو گیا۔ بینا کے والدین نے لڑکی کو رخصت کرنے سے انکار کر دیا اور تنسیخ نکاح کے لیے شہر قصور میں مقدمہ دائر کر دیا۔ محمد جبار نے اپنے مرد رشتہ داروں کی مدد سے بینا کو اغواء کر لیا۔ جبار نے ایک کمرے میں بند کر کے اسے کئی بار زنا بالجبر کا نشانہ بنایا۔ صبح بینا کو اس کے والدین کے حوالے کر دیا گیا۔ قانون کے مطابق محمد جبار کو سزا نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کی بینا سے شادی ہوئی تھی۔

انتقامی زنا بالجبر

دشمن خاندان سے بدلہ لینے کے لئے ان کی عورتوں کو زنا بالجبر کا نشانہ بنانا دیہاتی علاقوں میں عام ہے۔ زنا بالجبر کرنے والوں کی مظلوم عورت سے براہ راست کوئی دشمنی نہیں ہوتی۔ جلال پور پیروالہ ضلع ملتان میں ایک حاملہ خاتون اللہ وسائی کی کئی مردوں نے مل کر زبردستی عصمت لوٹی۔ ملزموں کی اس کے دیور سے دشمنی تھی۔ نواب پور میں ملزموں نے عورتوں کو مقامی بازار میں ننگا کر کے پھرایا۔ یہ بدلہ لینے کا انتہائی غیر انسانی طریقہ ہے۔ مچھرانوالی کی ایک لڑکی نے جب وہاں ایک مرد کا رشتہ نامنظور کر دیا تو اس مرد نے اپنے ساتھیوں سے مل کر اسے زنا بالجبر کا نشانہ بنایا۔ مقامی دشمنیاں آہستہ آہستہ خواتین کے سیاسی

استحصال کا باعث بھی بن رہی ہیں۔ خورشید بیگم اور وینا حیات دونوں کا بیان ہے کہ انہیں سیاسی وجوہات کی بنا پر زنا بالجبر کا نشانہ بنایا گیا۔ عدالتی نظام اب تک متاثرین کو انصاف فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس بارے میں انتظامیہ کا رویہ سنگدلانہ ہے۔ خورشید بیگم کا کہنا ہے کہ اسے اس کے خاوند کی سیاسی وفاداری کی وجہ سے زنا بالجبر کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے سندھ میں انصاف ملنے کی توقع نہیں مگر وہ دنیا کے ہر اس حصہ میں انصاف کے حصول کے لیے آواز بلند کرے گی جہاں اسے انصاف ملنے کی توقع ہو۔ اس لیے اس نے پنجاب آ کر مدد اور حمایت طلب کی ہے۔ عورتوں کی تنظیموں نے کئی بار پیش گوئی کی ہے کہ پاکستان میں زنا بالجبر کے جرم میں ابھی اور اضافہ ہو گا۔ قانون بڑی حد تک ملزموں کا ساتھ دیتا ہے۔ اس کے علاوہ زنا بالجبر کی قانونی تعریف اس کے مختلف طریقوں اور نوعیت کا احاطہ نہیں کرتی۔ شکایت کرنے والی عورت مصیبت میں مبتلا ہو جاتی ہے کیونکہ اگر وہ زنا بالجبر کا الزام عدالت میں ثابت نہ کر سکے تو وہ خود زنا کے الزام میں پھنس جاتی ہے۔ زنا سے مراد شادی کے بغیر جنسی تعلقات ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں زنا آرڈی نینس کے اطلاق کے بعد زنا کے جرم کی سزا قید اور کوڑے مقرر کی گئی۔ اگر کسی عورت کے ساتھ زنا بالجبر ہوا ہو اور وہ اس کی رپورٹ میں درج نہ کروائے تو علم ہونے پر اسے زنا کے مقدمہ میں گرفتار کیا جا سکتا ہے ایسے کئی واقعات ہو چکے ہیں کہ متاثرہ عورتیں خوف کے باعث خاموش رہیں جب حاملہ ہو گئیں تو راز کھل گیا۔ اس قسم کے دو بدنام زمانہ مقدمے ایک نابینا لڑکی صفیہ بی بی اور ایک ۱۳ سالہ لڑکی جہاں بینا کے ہیں۔ صفیہ بی بی خوش قسمت تھی کہ اپیلٹ کورٹ سے بری ہو گئی لیکن جہاں بینا کو زنا کی ایف آئی آر درج ہونے پر قید اور کوڑوں کی سزا دی گئی۔

قانون کی کمزوری، تفتیشی اداروں کی بدعنوانیاں، حکومت کی بے حسی، زنا بالجبر کے نتیجے میں بدنامی کا خوف اور پاکستان میں عورتوں کی کمتر حیثیت وہ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے عورتوں کے خلاف تشدد بڑھ رہا ہے۔

''یورپ............ اخلاقی گراوٹ کا شکار خطہ''

دوسروں کے عیب تلاش کرنے والے مکروہ کردار کا شکار ہیں

یورپ تہذیب دامن کا گہوارہ کہلانے میں بہت فخر محسوس کرتا ہے جبکہ اس کی تہذیب و اخلاقی اقدار ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ مغرب کی نوجوان نسل بے راہ روی کا اس قدر شکار ہو چکی ہے کہ انہیں اب واپسی کا کوئی راستہ نظر ہی نہیں آ رہا۔ دوسری طرف مغربی دانشور اس بات سے مسلسل پریشان ہیں کہ ایسے گمراہ نوجوانوں کی منزل کیا ہے اور یہ کس طرح ملک کے لیے مثبت کردار ادا کر سکیں گے۔ یورپ کو یوں تو بہت سے سنگین مسئلوں کا سامنا ہے لیکن اس وقت سب سے اہم مسئلہ بڑھتا ہوا جنسی رجحان ہے کہ جس کے باعث ایڈز جیسا موذی مرض بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اس جنسی رجحان کے بارے میں ''دی گارڈین نیوز سروس'' نے ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ رپورٹ کے مطابق رومانیہ کے دارالحکومت بخارسٹ کے نواح میں ایسے بیس بچوں کا پتہ چلا ہے کہ جو ابھی سن بلوغت کو نہیں پہنچے اور ان میں بعض کی عمریں صرف تین سال ہیں۔ جب ان کے پاس کوئی ''گاہک'' نہیں ہوتا تو وہاں کھیلتے ہیں اور کھانے کے لیے گندگی کے ڈھیروں سے خوراک تلاش کرتے ہیں اور وہی گندی جگہ ان کے سونے کا مقام ہے جبکہ سردیوں کے موسم میں وہ سیوریج کے لیے استعمال ہونے والے پائپوں میں سو جاتے ہیں۔

یہ بیس بچے ان چھ سو بچوں میں شامل ہیں کہ جو رومانیہ کے دارالحکومت کی گلیوں اور بازاروں میں مستقل طور پر قیام پذیر ہیں۔ موجودہ حالات میں کسی بھی طرح ان بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو سکتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ پندرہ سو مزید بچے ان میں شامل ہو جائیں۔ ان میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں غربت کی وجہ سے لڑکیاں بعض اوقات ایک پاؤنڈ یا ایک وقت کھانے کے لیے اپنے آپ کو گاہک کے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔ یورپ کے اکثر ممالک سے مرد حضرات جنسی تسکین کے لیے بخارسٹ آتے ہیں اور اپنا کام مکمل ہونے کے بعد دوبارہ اپنے اپنے ملکوں میں واپس چلے جاتے ہیں۔ جرمنی، فرانس، اٹلی اور برطانیہ کے تقریباً ۵۰ مردوں نے بخارسٹ میں فلیٹ کرائے پر لے رکھے ہیں اور وہ باقاعدگی سے بخارسٹ آتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان بچوں کو شاید خوش قسمت کہا جا سکتا ہے کہ یہ افراد ان

بچوں کو ہفتوں اپنے فلیٹ میں رکھتے ہیں اس دوران وہ انہیں خوراک، لباس اور تحفے تحائف خرید کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات یہ افراد نہیں ۵۰ ڈالر ماہانہ دیتے ہیں جو کہ رومانیہ کی قومی شرح آمدنی سے دوگنا ہے۔ اس سلسلہ میں فرانس سے تعلق رکھنے والا مائیکل خاص طور پر مشہور ہے۔

بچوں کے ساتھ جنسی تعلقات کا جب بھی ذکر آتا ہے تو سب سے پہلے دو شہروں بنکاک اور منیلا کے نام ذہن میں آتے ہیں لیکن بچوں سے جنسی تعلقات کے خلاف پہلی عالمی کانفرنس میں ماہرین نے اعتراف کیا ہے کہ یہ مذموم کاروبار اب مغرب میں بھی تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے۔ اس گھٹیا دھندے کے بارے میں پورے مشرقی یورپ سے پولیس، سماجی کارکنوں، سرکاری ملازمین، ارکان پارلیمنٹ، صحت کے شعبے سے وابستہ ورکروں اور بچوں سے جب اس مسئلہ پر اظہار خیال کے لیے کہا گیا تو سب نے اس بات پر سخت تشویش کا اظہار کیا جو علاقے میں بڑے پیمانے پر جڑ پکڑتی جا رہی ہے۔ مشرقی یورپ میں بچوں سے جنسی تعلقات استوار کرنے کے بارے میں اصل حقائق ان اعداد و شمار سے ہمارے سامنے آتے ہیں کہ لتھوینیا کے دارالحکومت ولسیس میں تقریباً تین سو بچے اس کاروبار میں ملوث ہیں جبکہ لٹویا کے دارالخلافہ میں ۴۶۲ رجسٹرڈ جنسی کلب موجود ہیں اور اندازہ ہے کہ گزشتہ چھ ماہ کے عرصہ میں ہی یہاں پر بچوں سے جنسی تعلقات میں ۴۰ سے ۵۰ فیصد تک اضافہ ہوا ہے۔ ایسٹونیا میں تقریباً ۱۵۰۰ بچے تو یہ دھندا کر رہے ہیں۔ پولینڈ میں تو یہ صورت خاصی گمبھیر ہو چکی ہے کہ یہاں پر لاتعداد بچے وارسا سے برلن جانے والی شاہراہ پر یہ کاروبار کر رہے ہیں۔ روس میں حالات اس سے بھی زیادہ خطرناک ہو چکے ہیں کہ صرف سینٹ پیٹرز برگ میں ایسے بچوں کی تعداد ۶۰۰۰ سے ۱۵۰۰۰ ہے۔ ان میں ۱۳ سے ۱۶ کی عمر کی لڑکیوں کے ایک گروپ کا دھندا ۱۴ سال سے بھی کم عمر لڑکے چلا رہے ہیں کیونکہ وہ اس جنسی فعل سے محفوظ ہیں۔ ماسکو میں آٹھ سال یا اس سے زائد عمر کی لڑکیاں صرف ایک وقت کی خوراک، سگریٹ یا شراب کے لیے اپنا آپ بیچ دیتی ہیں۔ ہنگری کے دارالحکومت بڈاپسٹ میں بھی یہی صورتحال ہے۔

(ہفتہ وار ''مہارت'')

عورتوں پر تشدد:

نوع انسانی یا انسانی جنس کے حوالے سے قدیم صحفوں اور دیو مالاؤں کے مواخذ میں اس طرح واضح اشارے ملتے ہیں کہ انسانی یا بشر نوعی اعتبار سے بہت پہلے مرد وزن یا نر اور مادہ کی تمیز کے بغیر ایک نفس واحد یعنی یکتائی نفس یا یونی سیل (Uni Cell) ہی تھا۔ جدید بیالوجی بھی اس طرف اشارہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ نوع انسانی میں نر اور مادہ (نر اور ناری) کا فرق اور جوڑوں سے تخلیق اور تولید کا عمل انسان کی ارتقائی منازل کا وہ سلسلہ یا کڑی ہے جس سے پہلے انسان دو عناطر پر مشتمل ایک ہی نفس تھا جو بہت حد تک خود کفیل تھا۔ اس میں ''اینی ما اور اینی مس'' (Anima and Animus) یونگ کے بقول دونوں موجود تھے اور ہیں۔

یونانی اور رومن دیو مالا میں بھی ''ہرموفروڈائٹ'' (Hermophrodite) کا وجود اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ایک ہی وجود میں دو وجود مغم تھے۔ یعنی ہرمیز دیوتا کا بیٹا اور افراد ڈائٹی دونوں ہرموفروڈائٹی میں تھے۔ بعد میں افراد ڈائٹی جو محبت کی دیوی کہلائی اور ہرمیز کا بیٹا ان دونوں کے وصال سے انسان نما وجود رونما ہوا جو نر اور مادہ کی شکل میں اساطیری آدم اور حوا کی شخصیتوں میں نمودار ہوئے۔ آدم حوا کی پسلی سے پیدا ہوا تھا یا حوا آدم کی پسلی سے تخلیق ہوئی یہ معاملہ روز آفرینش سے قطعی طور پر طے نہیں ہو پایا۔ اس بحث میں بھی عورت اور مرد کے راوبط اور تکریم وتحریم کے مسائل وابستہ ہیں۔ بہرحال ہرمیز ہرمٹ میں ایک بنیادی خصوصیت خود کفیل ہونے کی اور تنہائی اور یکتائی کا عنصر تھا جس سے یونانی اساطیر کے حوالے سے دیوتا بھی خار کھانے لگے۔ اس لیے اسے بھی دو وجودوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جو نر اور مادہ، مرد وزن، عورت اور مرد یا رجل اور نساء کی شکل میں انسانی تاریخ کے کسی بہت ہی قدیم عہد میں منظر عام پر آ گئے۔ یہ دونوں وجود جب حالت اتصال یا وصل کی کیفیت سے دو چار ہوتے تھے تو اس عمل تولید سے افزائش نسل کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ مادہ کے طبعی خواص اور تقاضوں میں شامل تھا کہ وہ بچے جنے اور ان کی ابتدائی پرورش کے مراحل کی ذمہ دار ہو۔ بچوں کی حفاظت، انہیں دودھ پلانا، برے اثرات سے محفوظ رکھنا، گرمی سردی سے انہیں بچانا، یہ تمام امور اس کی جبلت میں شامل تھے۔ دوسری طرف مرد کا کام ''جنگل''

میں ''جنگ'' اور تشدد کے بل بوتے پر شکار حاصل کرنا، خود اور مادہ کو ''جنگ'' اور دوسروں کے ''وار'' اور ان کی دسترس سے محفوظ رکھنا اور مدافعت اور مزاحمت کو بروئے کار لانا، اس کے جبلی تقاضوں اور جسمانی ساخت کے مطابق تھا۔ پتھر کی طرح سخت ہتھیار سے اس کی جسمانی ساخت مانوس تھی۔ پتھر کی طرح پھر لوہے اور دھت کے زمانے میں برچھا، بھالا، چھری چاقو، خنجر یہ سب اس کے جنگی آلات میں شامل تھے اور یہی اس کے تشدد کے آلات بنتے گئے۔

عورتوں پر تشدد محض جنسی حوالے سے ہی نہیں ہوتا۔ انسانی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا طبقہ یا قوم یا نسل نظر آئے گی جو پیہم تشدد کا شکار رہی ہو۔ لیکن ایک بات آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں نوع انسانی کا یہ ''بہتر نصف'' جسے ہم ''مادہ'' قرار دیتے ہیں انسانی تاریخ کے تمام معلوم ادوار میں تشدد کا مسلسل نشانہ بنتی رہی ہے۔ اس مادہ کی تخلیقی صفت شاید اس میں وہ قوا اور جبلت اتنی مقدار اور طاقت میں پرورش نہیں پانے دیتی جس سے وہ مرد کے مقابلے پر تشدد کا طاقت کے بل بوتے پر مقابلہ کر سکے۔ اس کی تولیدی قوت نے اس میں تشدد کی قوت کو کمزور رکھا ہے۔ اس کے رحم اور رحمی قوا حمل کا بوجھ اٹھانا اور مہینوں برداشت کرنا اس کی حفاظت کرنا یہ تمام امور اس کی جسمانی ساخت کے حوالے سے، نگہداشت، احتیاط، صبر اور مشقت کی صفات اسے ایک ارتقائی مجبوری کے طور پر اختیار کرنے پڑے۔ اس لیے وہ اس رنگ میں جسمانی طاقت کا مظاہرہ عمومی طور پر مردوں سے بہتر نہیں کر سکتی تھی۔ مردانہ جسمانی ساخت اس پہلو سے اس سے زیادہ توانا اور طاقت ور تھی گویا اس اعتبار سے جسمانی سطح پر جس میں زیادہ طاقت اور توانائی ہو گی اس کا حق ''مادہ'' اور ''مادی'' اشیا پر زیادہ ہوتا جائے گا۔ کیونکہ جنگل کے اصول اور معاشرتی اعتبار سے وہ تشدد کو زیادہ بروئے کار لا سکتا ہے۔ وہی بات ہوئی کہ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔'' لاٹھی اور بھینس کا رشتہ پرانا ہے۔ بہر حال اگر خالص جسمانی یا حیوانی طاقت ہی سچائی اور حق ہے تو پھر اس ''سچائی'' کا تشدد عورت پر ہمیشہ نازل ہوتا رہے گا۔ ''نزلہ بر عضو ضعیف''! حقوق انسانی پامال ہوتے رہیں گے۔

لیکن معاملہ اس سے زیادہ گمبھیر ہے! عمرانی نفیات، علم الانسان، قدیم تاریخ اور آرکیالوجی پر تحقیق کرنے والے جب آثار قدیمہ کا کھوج اور انسانی معاشرے کی تشکیل کے

ابتدائی مراحل کی تلاش میں سرگرداں ہو کر علمی تگ و دو کرتے ہیں تو انہیں دنیا کے کچھ خطوں اور علاقوں میں ایسے آثار ملتے ہیں جہاں زمانہ موجود میں مادرانہ سرداری نظام کے نقوش (Elements of Matriarchal system) اپنی اصلی حالت میں حیات پذیر نظر آتے ہیں۔ ایسے کئی قبائل اب بھی ہمالیہ کی بلندیوں پر مشرقی ہندوستان میں پائے جاتے ہیں، جہاں عورت کی سربراہی میں خاندان اور قبیلہ اپنا نظام چلاتا ہے۔ ایک عورت کے کئی خاوند ہیں اور اس حیثیت میں اس کی سپردگی اور سرداری میں اس خاندان کے لیے ذرائع معاش سے کام لے کر کفالت کا کام کرتے ہیں۔ وہ اسی عورت کی زیرنگرانی اپنے محدود ماحول میں اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر بے اطمینانی کی فضا اردگرد کے ماحول سے ان کے قبیلے یا خاندان میں در آئے تو وہ مرد اس قبیلے کو چھوڑ کر ہجرت کر سکتا ہے لیکن اس قبیلے کی جاری اور ساری نظام کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہاں عورتوں کے حقوق پامال نہیں ہوتے اور عورتوں پر تشدد بھی نہیں کیا جاتا لیکن اس کے ساتھ مردوں پر تشدد کی روایت بھی وہاں موجود نہیں۔ ہاں ''ہجرت'' کی روایت کسی حد تک ضرور ہے۔ جنت سے نکلنا ضرور پڑتا ہے۔ ان معاشروں میں زن، زیور، زر اور زمین کے مسائل ملکیت کے رنگ میں اس طرح دکھائی نہیں دیتے کیونکہ عورت پر کسی کا حق ملکیت نہیں۔ شاید اسی لیے وہاں جرائم کا ارتکاب بھی بہت کم ہے۔ لیکن ایسے معاشروں کی موجودہ حالت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انسانی معاشرے زوال پذیر ہیں۔ ان میں ترقی کی وہ برق رفتاری وہ طاقت اور وہ تاب و توانائی نہیں جو ''مردانہ معاشروں'' میں نظر آتی ہے۔

یہاں پر علم الانسان کا ایک یہ نظریہ بھی پیش کر دینا ضروری ہو گا کہ جب تک ابتدائی انسانی معاشرے میں پرورش اور افزائش نسل کے بنیادی پہلوؤں پر زور رہا عورت کی اہمیت اور کسی حد تک اس گھرانے اور خاندان میں اس کا رتبہ مادرانہ سرداری نظام کی صورت میں مستحکم رہا لیکن جب جنگل کی حدود سے نکل کر انسانی معاشرہ کثرت کے ساتھ میدانوں میں زراعت کو ذریعہ معاش بنا کر رہنے لگا تو ''کھیتی'' اور ملکیت کا احساس اجاگر ہونے لگا۔ کچھ بیج بونا اور فصل کاٹنا اور اس کو اپنا خزانہ یا خزینہ بنانا یہ تمام عوامل انسانی شعور میں اہمیت اختیار کرنے لگے اور اس طرح کاشتکاری اور زمینداری نظام کی شکل میں ملکیت (Possession) کا تصور انسانی معاشرے میں اہمیت اختیار کرتا گیا۔ مادی اشیا کی اہمیت

زیادہ ہوتی گئی اور اس اہمیت کے طفیل حفاظت، مدافعت اور نگہبانی میں طاقت کے استعمال کا تصور زیادہ واضح ہوتا گیا۔ اس طرح معاشرہ رفتہ رفتہ پدرانہ سرداری نظام کی طرف رخ اختیار کرتا گیا اور پدری میراث کی سرداری کا نظام (Patriarchal System) مستحکم ہو گیا۔ اس ملکیت اور مادیت کے زور کی وجہ سے ''مادہ'' خود بھی اس سرداری نظام کے تسلط میں ایک ملکیت یا خزانے کی صورت اختیار کر گئی۔ زر، زن اور زمین معاشرے کی ملکیت کے بنیادی عناصر بن گئے۔ آہستہ آہستہ مردانہ طاقت اور وجاہت زمین دارانہ نظام کی صورت میں غالب آ گئی۔ عورت کے جمالی پہلو کو زینت بخشنے کے لیے کانوں کی بالیوں سے لے کر پاؤں کی پائیلوں اور پازیبوں تک ''زیوروں'' کی اختراع ہونے لگی۔ عورت ایک خزانہ اور خزینے کی صورت اختیار کر گئی اور زیور اس کی زینت کے ساتھ اس کے پاؤں کی زنجیر بھی بن گئے۔ جب وہ زیوروں میں پلنے لگی تو اس کے جمال اور کمال کی کیفیت اور نوعیت بدلنے لگی اور اس کی ذہنی اور جذباتی صلاحیتوں کا استعمال بھی بدلتا گیا۔ اب عورت ایک شخصیت اور ''پرسن'' (Person) کے اعتبار سے کم اہم ہونے لگی اور ایک سرمائے اور دولت اور ملکیت کا رنگ اختیار کرنے لگی۔ اب اس کی قیمت لگنے لگی اور اسے بیچنے خریدنے کا کاروبار شروع ہو گیا۔ جہاں عددی اعتبار سے عورت کی زیادہ ضرورت ہوتی تھی وہاں اس کی زیادہ قیمت لگنے لگی اور جہاں عورتوں کی کثرت ہوتی تھی وہاں سے وہ تجارتی مال کی صورت میں بیچی جانے لگیں۔ یہ تجارتی تشدد نسوانی غلامی کا باعث بننے لگا۔ اسی سے عورت کا بیوپار اور لوٹ کھسوٹ کے واقعات رونما ہونے لگے۔

اس اعتبار سے آپ گر ویدک دیو مالا اور ہندومت کی اساطیر کا مطالعہ کریں تو آپ کو بخوبی یہ احساس ہو گا کہ ہندومت میں عورت کا وجود جمالیاتی سطح پر بے شک حسن اور جمال کا پیکر ہے لیکن اس کی چاہت، اس کی لگن شو دیوتا اور کام دیوتا کے توسط سے بربادی، تخریب اور عدم تحفظ کی طرف انسانی معاشرے کو لے جاتی ہے۔ بے شک عورت بیک وقت ''لکشمی'' (دولت) بھی ہے اور ''سرسوتی'' (علم وفن) بھی۔ لیکن وہ ساتھ ہی کالی بھی ہے۔ اس میں کامنی بھی ہے اور شکتی بھی اور شکنتلا بھی۔ وہ حسن بھی ہے، دولت بھی ہے اور سرمایہ بھی لیکن اس کے ساتھ تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ بھی۔ کیونکہ موہ اور مایا اور مادہ میں مانس کی شکست و ریخت مضمر اور مستور ہے۔ وہ دروپدی ہو کہ سیتا، مہا بھارت کی جنگ

ہو یا رام اور راون کی لڑائی، عورت ہر جگہ ''ہیلن آف ٹرائے'' کا رول ضرور ادا کرتی ہے۔

اگر دیو مالائی اور انسانی تاریخ سے اخذ شدہ ان عوامل کو سامنے رکھا جائے تو یہ ظاہر ضرور ہوتا ہے کہ تخلیقی عمل کے حوالے سے عورت کا مقام مرد سے بلند ہے۔ اسی لیے اسے نصف بہتر بھی کہا جاتا ہے۔ مرد تو محض ایک قطرے اور وہ بھی ایک ادھورے ''بیج'' یا تخم کا کام دیتا ہے۔ جدید بیالوجی کے نظریے کے مطابق اس تخم ریزی کے لیے مرد کی جسمانی موجودگی بھی کوئی ضروری امر نہیں۔ عورت تخلیقی عمل کے حوالے سے خود کفیل ہے۔ بیالوجی کے اصولوں کے مطابق لاکھوں میں سے کوئی ایک عورت ایسی بھی نظریاتی سطح پر ہو سکتی ہے جس کو مرد کے اس قطرے کے ایک ذرے یا اس ادھورے تخم کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس عورت میں یہ تخم بھی موجود ہوتا ہے وہ ہر طرح خود کفالت کے ساتھ بچے جنم دے سکتی ہے۔ لیکن انسانی معاشرے میں جب دوسرے معاشی اور معاشرتی عوامل اہمیت اختیار کر جاتے ہیں تو مردانہ طاقت، قوت اور وجاہت کی احتیاج عورت کی مجبوری بن جاتی ہے اور یہی مجبوری مردانہ طاقت کے غلط استعمال سے اس پر تشدد کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ وہ تشدد جنسی تشدد کی صورت میں ظاہر ہو کر ہر قسم کے تشدد کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ تشدد کا فروغ بھی اس کے ہاتھوں ہوتا ہے اور تشدد سے حفاظت اور بچاؤ کا انتظام بھی اسی نے سنبھالا ہوتا ہے۔ اس تسلط کے تحت انسانی معاشرے کا ارتقا ظاہر ہے ایسی نہج پر ہوا ہے کہ لاکھوں نہیں تو ہزاروں سال سے مردانہ جاہ وجلال اور پدرانہ سرداری نظام کے دبدبے کی وجہ سے عورت پر ایک لامتناہی تشدد اور جبر کا دور دورہ جاری ہے۔ عورت کی ذات اور شخصیت معاشرے پر بہت کم اثر انداز ہوئی ہے۔ اگر یہ حادثے اتفاقاً کہیں ہوئے بھی ہیں تو عورت نے شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے سامنے ''تسلط''، ''سرداری'' اور حکومت کے معیار وہی رکھے ہوئے ہیں جو ''مردانہ وجاہت'' اور مردانہ سرداری نظام کے طفیل ''سکہ رائج الوقت'' تھے اور یہی حال موجودہ انسانی معاشرے کا ہے۔ عورت کے ہاتھ میں اگر خاندان یا قبیلے یا قوم کی قیادت کا کام سونپا بھی گیا ہے تو اسکے لاشعور میں ایک شدید ''احساس کہتری'' کارفرما ہوتا ہے اور اسی احساس کی الجھنیں اس کو معاشرے کی لیڈرشپ کے لیے ''مردانہ صفات'' کے ''ہیولے'' اور چکا چوند سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔ وہ ''مرد آہن'' بن کر دکھانا چاہتی ہے لیکن پھر بھی اسی ''ہیرو'' کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی ہے جو اپنی ماورائی طاقتوں سے انسانی

معاشرے کی اصطلاح کا کام اپنی وراثتی جبروت اور جاہ وجلال سے کرنے کا خوگر ہوتا ہے۔

عورت کا یہ احساس کہتری انسانی تہذیب اور تمدن کے تمام ادوار میں داخل رہا ہے۔ عورت خود اس احساس میں گرفتار تھی اور گرفتار ہے اور ''مردانہ معاشرے'' کے تمام اداروں میں اسی اصول پر عورت سے سلوک کیا جاتا ہے کہ وہ مرد سے کم تر اور کمزور ہے۔ اس کے ساتھ ہمدردی بھی اسی تاثر کے تحت کی جاتی ہے اور ظلم بھی اسی احساس برتری کے تحت کیا جاتا ہے کہ عورت کی شکست و ریخت مرد کا بنیادی حق ہے اور معاشرہ ہمیشہ سے انہی اصولوں کی پاسداری کرتا آیا ہے۔

اسی حوالے سے آپ ساری انسانی تاریخ کو دیکھیں تو آپ کو تمام ادوار میں، چاہے وہ قدیم انسانی تہذیب اور تمدن کے ہوں یا قرون وسطٰی سے ان کا تعلق ہوتا ہے وہ مغرب کا تمدن ہو یا مشرق کا۔ وہ یونانی یا ایرانی اور تورانی یا چینی، ہندی یا جاپانی، ہر جگہ عورت پر ہر قسم کا تشدد آزمایا جاتا رہا ہے۔ وہ جسمانی تشدد سے بھی دو چار رہی، جنسی تشدد کا بھی مسلسل نشانہ بنتی رہی اور سیاسی اور اقتصادی تشدد کا بھی ہمیشہ شکار رہی۔ اس پر طبعی اور بدنی اذیتوں کے ساتھ ہر قسم کا ذہنی اور جذباتی تشدد آزمایا گیا۔ کم تر اور کمزور ہونے کے احساس کے ساتھ حقارت اور نفرت کے جذبات کے ساتھ۔ کیونکہ ''نظریہ ملکیت'' کے طفیل اسے ہر فساد کی جڑ سمجھا گیا۔ وہ ''دروپدی'' تھی یا ہیلن تھی۔ تھی تو ''حوا کی بیٹی''۔ اگر حوا کا بیٹا ہوتی تو بے شک ہابیل اور قابیل بن کر لڑائی جھگڑا کر کے فساد کا سہارا لے کر تشدد برپا کر کے اپنا کام تو چلا لیتی۔ اس لیے ازل سے عورت کو گھر اور خاندان میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ معاشرے میں جبر اور ظلم کے ساتھ اس کو ہر چیز کا ہر کام کا معاوضہ کم دیا گیا۔ جائیداد اور وراثت سے یا تو اسے بالکل محروم کر دیا گیا اور اگر کچھ دیا بھی تو وہ بھی برائے نام۔ اس ہاتھ دے کر اس ہاتھ لے لیا گیا۔ بے شک تمام مقدس مذاہب میں اس کے حقوق کی پاسبانی کے لیے فرمان تو شامل کیے گئے لیکن ان پر عمل بہت کم ہوا۔ اگر کہیں ہوا بھی تو بہت تھوڑے عرصے کے لیے۔

مذہبی اقدار اور ان کے زیر اثر ادوار کا قصہ اگر ہم چھوڑ بھی دیں تو کوئی خاص فرق کہیں نمایاں نظر نہیں آتا۔ آپ سیکولر اقدار والے معاشرے لے لیں۔ پچھلے کئی سو سال سے مغرب میں ''سیکولر اقدار'' کا چرچا ہے۔ فہم و فراست (Age of Reason) کے اس عہد

پر ''مغرب'' بہت نازاں ہے۔ تمدن اور ثقافت اور تہذیب ان تینوں پہلوؤں سے مغرب نے عقل، سائنس اور ادراک کے بل بوتے پر بے پناہ ترقی کی ہے اور معاشرے کا حلیہ بظاہر بدل کر رکھ دیا ہے لیکن کیا عورتوں کے بارے میں ان کے رویوں میں اچھی تبدیلیاں آئی ہیں؟

عورت کی زینت کے سامان بدل گئے ہیں۔ بے شک وہ زیادہ خوبصورت اور شاید زیادہ بے حجاب اور بے باک ہو کر گلی کوچوں اور ناچ گھروں میں کودتی پھرتی نظر آتی ہے لیکن اس پر ہر قسم کے تشدد کی شرح میں اس کی آبادی اور پیدائش کی شرح کے مقابلہ میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ وہ زیادہ ''پٹتی'' جاتی ہے۔ شراب کے نشے میں اسے زیادہ مارا جاتا ہے۔ اس پر جنسی تشدد زیادہ کیا جاتا ہے۔ اسے طلاق کا نشانہ زیادہ بنایا جاتا ہے۔ اس کے بچوں کو زیادہ اس سے چھینا جاتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ محنت، مزدوری اور ملازمت کر کے بھی اجرتوں کے اس معیار کو چھو نہیں پائی جو مردوں کو حاصل ہے۔ ''شرح خواندگی'' میں اضافے کے باوجود وہ معاشرے میں مردوں کے مقابلہ میں معاشرتی سطح پر بہت پیچھے ہے۔ آبادی کا نصف اور انگریزی اصطلاح میں نصب بہتر ہونے کے باوجود قانون نافذ کرنے والے اداروں میں عدلیہ میں، مقننہ میں، حکومت میں اس کا عمل دخل روز اول کی طرح برائے نام ہے۔ یہ سب کچھ کن اقدار اور کن اصولوں کی بنا پر مغرب کے عظیم تمدن میں آج بھی ہو رہا ہے۔ کل بھی ہو رہا تھا اور شاید کل بھی ہوتا رہے گا؟

مشرق کا تو بے شک آپ نام ہی نہ لیں وہ تو ہے ہی پس ماندہ اور ناخواندہ۔ وحشی اور جنگلی افریقہ ہو یا مہذب ایشیا قدیم اور عظیم روایتوں کا پاسدار۔ لیکن عورتوں کے معاملے میں ''باملاحظہ ہوشیار'' اور تشدد کے لیے ہر وقت تیار!

ایک اور پہلو سے عورت اور مرد کے نقطۂ نظر اور طرز عمل کو بھی ہمیں دیکھنا چاہئے۔ جدید سوشیالوجی نے جرائم کی شرح کے سلسلے میں جو تحقیق کی ہے اس کی رو سے اگر مرد چھ قتل کرتا ہے تو عورت اس کے مقابلے میں 1/2 قتل کرتی ہے۔ یعنی ایک بھی نہیں بلکہ ''ادھ موا'' ہی چھوڑ دیتی ہے۔ مرد ڈاکے، چوری اور دنگا فساد کی آٹھ واردات کرتا ہے تو عورت اس کے مقابلے میں موجودہ مغربی معاشرے میں صرف ایک دنگا فساد اور جھگڑا کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ مرد ۲۲ چوریاں کرتا ہے تو عورت ایک۔ مرد ۳۰ ڈاکے ڈالتا ہے تو عورت

ایک۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ یا تو عورت طبعی اور فطری طور پر تشدد اور جرم کی طرف مائل نہیں۔ یا پھر تہذیب جو کہ ''مردانہ'' ہے اس نے اسے اتنا دبا رکھا ہے کہ وہ مرد کی طرح اپنا ''ردعمل'' دکھا نہیں سکتی۔ بہرحال خیال اس طرف کم جائے گا کہ اس کا طبعی فطری رجحان اور میلان ''تخلیق'' کی طرف ہے۔ وہ ''رحم'' اور ''رحمی'' مادے سے اٹھائی گئی ہے۔ اس میں انسان کی ''انسانیت'' زیادہ ہے۔ ''حیوانیت'' کم ہے۔ ''بشریت'' کے مقابلے میں ''آدمیت'' سے اس نے زیادہ حصہ پایا ہے اور چرچا مرد کا ''مردانہ معاشرے'' میں زیادہ ہے۔ وہ رحمی رشتوں کی وجہ سے رحمان اور رحیم کی الٰہی صفات کے زیادہ نزدیک ہے۔ اس میں مادرانہ ''ربوبیت'' زیادہ ہے۔ وہ خاندان کی ماں بھی ہے مادر وطن تھی اور مادر ملت بھی اور انسانی معاشرہ اس وقت کس کی تلاش میں ہے؟ جلال اور جاہ وحشمت کی اسے تلاش ہے۔ جبروت کا انتظار ہے۔ یا جمال کا اور امن و امان کا۔ سکون کا اور اطمینان کا۔ وہ آغوش مادر کی طرف لوٹنا چاہتا ہے کہ باپ کے ساتھ نئی سرزمینوں اور نئی املاک پر قبضہ جمانا چاہتا ہے اور تسخیر کے سفر میں نئے تشدد کے مدوجزر سے گزرنا چاہتا ہے؟ یہ سوال بھی بہت اہم ہے اور اس کا جواب بھی بہت صبر آزما ہے۔ کتاب کے آخر میں شاید اس بارے میں ایک دو باتیں ہم آپ سے کر سکیں لیکن فی الحال اس باب میں ہم آپ کو چند ایسے واقعات سے روشناس کروانا چاہتے ہیں جو عورتوں پر تشدد کے سلسلے میں ان برسوں میں پاکستان میں روا رکھے گئے ہیں یہ محض مثال کے طور پر ادھر ادھر سے لیے گئے ہیں تا کہ آپ کو کسی معین نقطہ نظر سے اثر انداز کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ہمارا مقصد بھی یہ نہیں ہے اس لیے متفرق واقعات حسب ذیل ہیں۔

جہد حق (HRCP کا ماہنامہ مجلّہ)

سیالکوٹ..........خواتین تنازعہ زمین کا شکار

تھانہ کوٹلی سید امیر علی کے موضع جوگو چک میں بااثر افراد نے ایک محنت کش محمد خان کی بیوی اور بیٹی کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور مزاحمت پر انہیں چھریاں مار کر شدید زخمی کر دیا۔ تفصیلات کے مطابق فضل دین اور محمد خان وغیرہ کے درمیان زمین کا تنازعہ چلا آ رہا تھا۔ گزشتہ روز فضل دین نے ساتھیوں سمیت محمد خان کے گھر دھاوا بول دیا اور محمد خان کی

شادی شدہ بیٹی جو کہ میلے آئی ہوئی تھی پر دست درازی کی جس سے اس کے کپڑے پھٹ گئے۔ انور کی ماں رشیدہ بیٹی کو بچانے کے لیے آگے بڑھی تو ملزمان نے نہ صرف اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے بلکہ چھریوں کے پے در پے وار کر کے رشیدہ اور انور بی بی کو زخمی کر دیا۔ بعد ازاں رشیدہ کے خاوند محمد خان کو بھی گھر آتے روک کر آہنی مکوں اور لاٹھیوں سے زخمی کر دیا اور موقع سے فرار ہو گئے۔

امجد محمود رکن HRCP

سوات............عورت کا قتل

نواحی علاقہ کالا گرام میں ایک خاتون کو نامعلوم افراد نے بے دردی سے قتل کر دیا۔ مقتولہ کے جسم پر تشدد کے کافی نشانات تھے۔ دو دن کے بعد مقتولہ کی لاش کھیتوں میں پائی گئی۔ گاؤں کے افراد نے قتل کی اس واردات میں مقتولہ کے رشتہ داروں پر الزام عائد کیا ہے۔ پولیس اس سلسلے میں مقتولہ کے رشتہ داروں سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔

سرگرم کارکن

پشین............ بیوی کو کنویں میں گرا دیا

کلی تورہ میں خاوند سے ناراض ہو کر بیوی اپنے بھائیوں کے گھر اپنے دو بچوں کے ساتھ چلی گئی تھی۔ ایک مہینہ گزر جانے کے بعد خاوند اپنے سالوں کے گھر گیا اور بیوی کو گھر جانے پر رضا مند کر کے گھر لے جا رہا تھا۔ راستے میں کنواں تھا جب وہ اس کے قریب پہنچے تو خاوند نے بیوی سے کہا کہ کنواں اندر سے بہت خوبصورت ہے۔ بیوی نے جیسے ہی کنویں میں جھانکا اس ظالم خاوند نے اپنی بیوی کو دھکا دے دیا۔ بیوی کنویں میں پڑے گارڈر سے ٹکرا کر ہلاک ہو گئی۔ دو بچے جو ساتھ تھے انہوں نے شور مچایا۔ باپ نے انہیں ڈرا دھمکا کر چپ کرانے کی کوشش کی مگر بچوں نے بھاگتے ہوئے قریب کے لوگوں کو خبر دی بچوں کے باپ کو جب پتہ چلا کہ لوگ اس طرف دوڑتے ہوئے آ رہے ہیں تو خود بھاگ کر فرار ہو گیا۔

وہاڑی............آٹھ سالہ مظلوم بچی

۸ سالہ رقیہ بی بی اپنے گاؤں کی ایک خاتون شریفاں بی بی سے ناظرہ قرآن پاک کی تعلیم حاصل کر رہی تھی اور اس سلسلہ میں روزانہ اس کے گھر جایا کرتی تھی۔

چند روز قبل معمول کے مطابق وہ درس حاصل کرنے کے لیے شریفاں کے گھر گئی تو وہ گھر پر موجود نہ تھی بلکہ اس کا ۵۵ سالہ بھائی محمد اقبال اکیلا تھا جو معصوم بچی کو بہلا پھسلا کر کمرہ کے اندر لے گیا اور جنسی درندگی کا نشانہ بنا ڈالا۔ لڑکی کی چیخ و پکار پر اہل محلّہ اکٹھے ہو گئے جس پر ملزم موقع سے فرار ہو گیا۔ خون میں لت پت رقیہ کو ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال داخل کروا دیا گیا۔

کارکن نامہ نگار

ڈیرہ اسماعیل خاں............۱۰ سالہ بہری، گونگی

۹ یا ۱۰ سالہ شہناز بی بی گونگی، بہری ہے۔ اپنے گھر واقع جھوک کلڑ تھانہ گومل یونیورسٹی سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع کھڈ میں رفع حاجت کے لیے تقریباً سہ پہر کے وقت گئی تو وہاں پر ۱۸، ۱۹ سالہ نوجوان رحمت اللہ ولد صفدر کے جنسی تشدد کا نشانہ بنی۔ بچی کی چیخ و پکار سے دیہہ کے ایک شخص نے موقع پر ملزم رحمت اللہ کو پکڑ لیا اور اسے شہر کے مولوی کے پاس لایا لیکن رحمت اللہ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا جسے بعد ازاں مقامی پولیس نے گرفتار کیا۔ میڈیکل کی رپورٹ سے معصوم شہناز کے ساتھ زیادتی کی تائید ہوئی۔ اس کے جسم پر تشدد کے نشانات بھی ہیں۔ رحمت اللہ کی ضمانت سول جج نے منظور کر لی۔ مقامی لوگ ملزم کے لیے سخت سزا کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

کارکن HRCP

نواب شاہ............۱۳ سالہ بچی کے ساتھ اجتماعی جنسی تشدد

۱۳ مارچ ۱۹۹۶ء کی رات موضع حاجی خاں، ضلع حیدرآباد کا اشرف خاص خیلی اپنی ۱۸ سالہ بیوی وسندی کے ہمراہ ایک عزیز کی شادی سے واپس آ رہا تھا کہ گنوں کے کھیت کے قریب تین افراد غلام قادر اور منظور وغیرہ نے ان پر حملہ کر دیا اور اشرف خاص خیلی کو

رسیوں سے باندھنے کے بعد اس کی بیوی کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا۔ پولیس نے ملزمان کے خلاف مقدمہ درج کر لیا ہے لیکن ان میں سے کسی ملزم کو ابھی تک گرفتار نہیں کیا۔ اشرف خاص خیلی اور اس کی بیوی نے الزام عائد کیا کہ ملزمان انہیں راضی نامہ کرنے پر مجبور کر رہے ہیں جبکہ علاقے کا ایم پی اے بھی اس کوشش میں ملوث ہے۔

گھوٹکی............ دوخواتین کے ساتھ جنسی تشدد

رونتی نزد گھوٹکی کی دو خواتین، کوثر اور رمضانو، ۱۴ مارچ ۱۹۹۶ء کو اپنے جانوروں کے لیے گھاس کاٹ رہی تھیں کہ چھ مسلح افراد نے ان پر حملہ کر دیا اور جنسی تشدد کا نشانہ بنایا۔ ملزمان کے خلاف مقدمہ درج کرنے کے بعد پولیس نے تین ملزمان شبیر چاچڑ، خمیسو اور ڈوڈل کو حراست میں لے لیا ہے جبکہ تین ملزمان کی تلاش جاری ہے۔

بدین............ ۱۲ سالہ بچی کے خلاف درندگی

بدین میونسپلٹی کے چار ملازمین بابو شیدی، اسلم شیدی، چونگو شیدی اور عبدالحق شیدی، ایک شخص حاجی رمضان کے گھر زبردستی گھس گئے اور ایڈمنسٹریٹر میونسپلٹی بدین کی کار میں اس کی بارہ سالہ بیٹی آمنہ کو بٹھا کر لے گئے۔ اس بچی کو جنسی تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد وہ اسے گھر چھوڑ گئے۔ مقدمہ درج کرنے کے بعد پولیس نے چاروں ملزمان کو حراست میں لے لیا ہے۔ بچی علاج کی خاطر ہسپتال میں داخل ہے۔

اجتماعی جنسی تشدد کا نشانہ

خیر پور کے نزدیک موضع ودھیر میں پانچ مسلح افراد نے ایک خاتون مسمات طاہرہ عرف امتیاز کو جان کی دھمکی دے کر اجتماعی بربریت کا نشانہ بنایا۔ پولیس نے مقدمہ درج کرنے کے بعد پانچ افراد حماد اللہ، عبدالغنی، حاکم عندالغفور اور جمال دین کو حراست میں لے لیا ہے۔

بچے کے خلاف بربریت

تین افراد، شاہ نواز رک، پریال رک اور صحبت رک نے مبینہ طور پر ایک بچے روشن علی کلاچی کے ساتھ اجتماعی طور پر جنسی تشدد کا ارتکاب کیا۔

خاتون کے خلاف اجتماعی جنسی تشدد

داری گوٹھ کے بدر دین اور اللہ بخش سیال نے مبینہ طور پر اسی گاؤں کی مسمات امیراں کو اس وقت ہوس کا نشانہ بنایا جب وہ ایک پڑوسی کے ہاں ٹیلی وژن دیکھ کر گھر واپس آ رہی تھی۔

مقدمہ درج کرنے کے بعد پولیس نے ملزمان کو گرفتار کر لیا ہے۔

جنسی تشدد کے بعد ۷ سالہ بچے کا قتل

ایک اطلاع کے مطابق چار افراد ممتاز خاص خیلی (ایک ٹیچر) مشتاق خاص خیلی، زاہد لاشاری اور ایک نامعلوم شخص نے کوٹ لاشاری سے ایک سات سالہ بچے فقیر محمد کو اغوا کیا اور اسے ایک سنسان جگہ پر لے گئے۔ جہاں انہوں نے بچے کو اجتماعی جنسی تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کر دیا۔ ملزمان نے بچے کی لاش کو جلانے کی کوشش کی لیکن چند افراد کے وہاں پہنچنے پر وہ اس جگہ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ پولیس نے مقدمہ درج کرنے کے بعد تمام ملزموں کو گرفتار کر لیا ہے۔

عورتوں کی خرید و فروخت

ڈہرکی پولیس نے محلّہ عبدالرحیم میں واقع ایک مکان پر چھاپہ مار کر ایک اغوا شدہ خاتون مسمات فریدہ کوثر کو برآمد کر لیا اور تین افراد بشیر ملک، غلام فرید اور حسن ملک کو حراست میں لے لیا۔ مغویہ نے پولیس کو بتایا کہ اس کی علی شیر سے شادی ہوئی تھی مگر ایک شخص افضل اور اس کے ساتھیوں نے اسے اغواء کر لیا جنہوں نے اسے جنسی تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد عبدالرزاق کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ عبدالرزاق نے اسے صادق آباد کے ایک شخص غلام سرور کے ہاتھ ۳۰،۰۰۰ روپے میں فروخت کر دیا۔ غلام سرور ہفتہ بھر اسے جنسی تشدد کا نشانہ بناتا رہا پھر اس نے اسے ایک شخص غلام فرید کے ہاتھ فروخت کر دیا جو اسے ڈہرکی لے آیا اور ایک مکان میں بند کر دیا جہاں اس پر جنسی تشدد کیا جاتا تھا۔ پولیس نے اس سلسلے میں مقدمہ درج کرنے کے بعد گیارہ افراد کو حراست میں لے لیا ہے۔

دادو..................شادی شدہ ہاری خاتون کا جبری نکاح

موضع واہی پانڈی کے ایک کاشتکار محمد صدیق رستا نے یکم مارچ ۱۹۹۶ء کو شکایت درج کرائی کہ اس کی بیوی گلاں کو گاؤں کے ایک زمیندار نے اغواء کر لیا ہے اور اس زمیندار نے پولیس کی مدد سے اسے گاؤں سے نکلوا دیا جس کے بعد محمد صدیق نے نواب شاہ میں سردار شیر محمد کی زمینوں میں پناہ لی۔ سردار شیر محمد نے بھی محمد صدیق کی کوئی مدد کرنے سے معذوری کا اظہار کیا ہے۔

شہداد کوٹ............خاتون اور اس کی تین بچیاں حوالات میں بند

۲۱ فروری ۱۹۹۶ء عیدالفطر کی رات، شہداد کوٹ کے ایک شخص نور محمد نے اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کر دیا اور گھر سے بھاگ گیا۔ ایریا پولیس نے اس کے گھر پر چھاپہ مار کر اس کی پہلی بیوی مسمات سدوراں اور تین بیٹیوں، نذیراں (۶) بیگم (۳) اور شریفاں (۲) کو حراست میں لے لیا اور انہیں تھانہ شہداد کوٹ کی حوالات میں بند کر دیا۔ جب پولیس حکام سے اس سلسلے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ سب متعلقہ افراد کے تحفظ کو مدنظر رکھ کر کیا گیا ہے کیونکہ مبینہ قاتل کی پہلی بیوی مسمات سدوراں اس واقعہ کی عینی شاہد ہے۔

گڑھی یاسین............اسلحہ ایکٹ کا ۱۲ سالہ ''ملزم''

۷ مارچ ۹۶ء کو گڑھی یاسین پولیس نے موضع مارورا کا کے پوٹا میں چھاپہ مارا اور زبردستی لوگوں کے گھروں میں گھس گئی۔ پولیس نے ایک شخص ابراہیم کا کے پوٹا سے ایک لائسنس یافتہ پستول برآمد کرنے کے بعد اس کے ۱۲ سالہ لڑکے ریاض کا کے پوٹا کو حراست میں لے لیا اور اسے تھانے لے گئی۔ پولیس نے لڑکے کی رہائی کے لئے ۵۰۰۰ روپے کا مطالبہ کیا لیکن جب اس کے باپ نے اس سلسلے میں اپنی معذوری کا اظہار کیا تو ۱۲ سالہ لڑکے کے خلاف اسلحہ ایکٹ کے تحت مقدمہ درج کر لیا گیا۔ اس پر الزام عائد کیا گیا کہ اس کے پاس سے اپنے بھائی کا لائسنس یافتہ پستول برآمد ہوا۔ بچے کے لواحقین نے اعلیٰ حکام سے استدعا کی ہے کہ ان کے ساتھ انصاف کیا جائے۔

تھرپارکر............خاوند اور سسر کے ہاتھوں قتل

گاؤں سادورے کی مسمات سونی بائی ایک اور خاتون زینب کے ہمراہ اپنے عزیزوں سے ملنے قریبی گاؤں میں گئی۔ جس کا اس کے خاوند اور خاندان کے دیگر افراد نے برا مانا۔ اشتعال میں آ کر اس کے خاوند اور سسر نے اس کا گلا دبا کر اسے قتل کر دیا۔ زینب پر بھی قاتلانہ حملہ کیا گیا لیکن وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ پولیس نے اس سلسلے میں مقدمہ درج کرلیا ہے اور مزید تفتیش جاری ہے۔

سکھر............ بیوی کو ماں کی مدد سے جلا کر ہلاک کرنے کی کوشش

۲۰ مارچ ۹۶ء کو سندھ سوسائٹی، سکھر کے رقیم حسین نے اپنی والدہ کی مدد سے اپنی بیوی مسمات لائقہ بانو پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ لائقہ کی چیخیں سن کر اس کی بہن عقیلہ جائے واردات پر پہنچی اور آگ بجھا کر اپنی بہن کی جان بچانے میں کامیاب ہوگئی۔ اسی اثناء میں ملزمان وہاں سے بھاگ گئے۔ لائقہ کو زخمی حالت میں ہسپتال پہنچا دیا گیا جہاں وہ زیر علاج ہے۔ لائقہ نے بتایا کہ اس کا خاوند اور ساس اسے اذیتیں دیا کرتے تھے اور جب وہ اس کے خلاف احتجاج کرتی تھی تو اسے جلا کر ہلاک کر دینے کی دھمکیاں دیتے تھے۔

رپورٹ: سندھ ٹاسک فورس

ماہ نومبر میں عورتوں پر ظلم وتشدد کے ۲۸۹ واقعات کی خبریں شائع ہوئیں جن کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ اجتماعی جنسی تشدد: ۲۵ عورتوں کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی وارداتیں ہوئیں ان سے کچھ ہلاک ہوگئیں ان کی لاشیں کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر اور ہسپتال کے احاطوں میں پڑی ملیں۔

۲۔ ۳۵ عورتوں کے ساتھ جنسی تشدد کیا گیا۔ کچھ معصوم اور کم سن بچیاں بھی اس وحشت کا شکار ہوئیں اور اکثر اس ظلم سے جانبر نہ ہوسکیں۔

۳۔ جنسی تشدد کی کوششیں: ۸ عورتوں کے ساتھ جنسی تشدد کی کوشش کی گئی۔ رشتہ

داروں یا ہمدرد افراد کی بروقت مدد سے وہ محفوظ رہیں۔

۴۔ زیادتی کا الزام: ایک عورت جس نے اپنے ساتھ جنسی تشدد کی شکایت کی ملزم مرد کے بیان کے مطابق مکان کا کرایہ ادا کرنے سے بچنے کی خاطر ایسا کر رہی ہے۔

۵۔ جنسی تشدد اور قتل: ایک عورت کے ساتھ زیادتی کے بعد اسے مار ڈالا گیا۔

تشدد:۔

عورتوں پر تشدد تو گھر کے اندر بھی اور باہر بھی اسی شدت سے ہوتا ہے۔ عورت چاہے گھریلو ہو یا باہر روزگار کمانے والی، مسلسل تشدد کا شکار ہے۔ اس تشدد نے نہایت گھناؤنی صورت اختیار کر لی ہے۔ صرف پنجاب میں ہی سال کے پہلے تین ہفتوں میں ساتھ (۶۰) مقدمات پیش ہوئے جن میں سے ۴۴ تو صرف لاہور ہی سے دائر کئے گئے۔ کم از کم آدھے کیس تو ایسے تھے کہ پولیس نے یا تو رجسٹر ہی نہیں کیے تھے یا پھر مقدموں کو طول دیتے دیتے اور زیادہ وقت پوچھ گچھ میں ہی گزارتے رہے۔ زنا، اغوا اور قتل کے کیس، سب کا یہی حشر ہوا۔

سال بھر کی رپورٹ کے مطابق اندازاً ہر تیسرے گھنٹے ایک عورت زنا کا نشانہ بنتی ہے، دو عورتیں ہر روز اجتماعی زنا کا نشانہ بنتی ہیں، ان سب میں زیادہ تر اٹھارہ برس سے کم عمر کی ہوتی ہیں یا نابالغ لڑکیاں ہوتی ہیں۔

پنجاب میں اس کا انداز کچھ یوں ہے:۔

مجرمانہ زنا اکثر لڑکیوں کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جیسے کہ لاہور میں سال کے آخر میں لڑکی نے اپنے آپ کو جلا دیا تھا۔ ایک نے ٹیوب ویل میں چھلانگ لگا کر جان دے دی تھی اور ایک نے چھت سے کود کر نیچے گرتے ہی دم توڑ دیا تھا۔

زنا کے واقعات میں عموماً ایک سے زیادہ لوگ شامل ہوتے ہیں کیونکہ جوان لڑکی کو اغوا کرنا اور بھاگ دوڑ کر پکڑنا ایک آدمی کے بس کا کام نہیں ہوتا اور اس بھاگ دوڑ میں بہت خطرہ بھی مول لینا پڑتا ہے اس لیے مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔

جوان لڑکیاں اور چھوٹی لڑکیاں بھی اس کا شکار ہو جاتی ہیں۔ صرف ایک مہینے، جنوری ۹۶ء میں پنجاب میں انتیس (۲۹) حادثوں میں، جن میں زنا، قتل اور اغوا شامل ہیں،

اٹھارہ شکار ہونے والیوں میں ۵، ۷، ۱۱، ۱۴ اور ۱۵ برس کی تھیں۔ اس طرح یہ سب لڑکیاں کم عمری میں زنا کا شکار بنیں اور ان کے زنا میں بہت سے بااثر افراد ملوث تھے۔

عورتوں سے بدسلوکی اور بے عزتی

دوسرے لوگوں کی موجودگی میں عورتوں کو گالی گلوچ اور مار دھاڑ کرنا خصوصاً پنجاب میں یہ ایک عام جرم ہے۔ یہ جرم یا تو عموماً گھرانوں کی روایات میں شامل ہوتا ہے یا پھر کسی خاص سزا کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ اس سال کے دوران ایسے اڑتالیس (۴۸) واقعات سامنے آئے۔ جن میں سے چار واقعات جنوری میں پیش آئے۔ ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ تین لڑکیوں کو برسر عام ننگا کیا گیا۔ لاہور میں ایک نوجوان لڑکی جو ایک بس میں سوار تھی وہ اپنے ساتھ بس میں سوار چار مسافروں سے مقابلہ کرتی رہی جبکہ باقی مسافر خوفزدہ ہو کر برف بنے بیٹھے رہے اور جب لڑکی نے اپنے آپ کو تین کے مقابلے میں بے بس پایا تو بس سے چھلانگ لگا دی اور بس کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی............ ایک اور واقعہ میں ایک دس برس کی لڑکی کو سرِ عام ننگا کیا گیا اور بازار میں گھسیٹا گیا۔ تیسرا کیس فرزانہ کا ہے جو بھائی پھیرو میں واقع ہوا۔ وہاں مینا بازار میں ایک بارسوخ گھرانے کے کچھ لوگ اندر گھس آئے جنہیں اندر گھس آنے پر منع کیا گیا کیونکہ مینا بازار میں تو صرف عورتیں ہی آ سکتی ہیں مگر ان لوگوں نے فرزانہ کو ننگا کر کے بازار میں گھسیٹا۔ لڑکی نے آخر کار خودکشی کر لی، وہ اپنی ایسی ذلت برداشت نہ کر سکی۔ چوتھا کیس آمرو منچن آباد میں ہوا۔ ایک بڑے زمیندار کے کرائے کے آدمیوں نے کمہار کے گھر دھاوا بول دیا اور اس کی لڑکیوں کو ننگا کر کے گھر سے باہر پھینک دیا۔

ملتان میں محض خاوند کو دوسری لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ سے منع کرنے پر خاوند نے بیوی کے چہرے پر تیزاب (Acid) پھینک کر اسکا چہرہ بری طرح جھلس دیا۔

پولیس کی زیادتیاں:۔

پولیس کے قبضہ میں عورتوں سے پولیس کا ذلت آمیز سلوک ایک عام سی بات ہے حالانکہ قانوناً عورت ملزم کی پوچھ گچھ زنانہ پولیس ہی کر سکتی ہے، یا ملزمہ کو جیل میں بند رکھا جانا چاہئے۔ مگر کوئی قانون اس پر عمل نہیں کرواتا۔ ہم جنوری ۹۶ء کے اولیندنوں کے

کچھ واقعات بیان کرتے ہیں۔

لاہور مال روڈ پر پولیس نے ایک عورت کو پکڑ لیا جو اپنے بیمار خاوند کی صحت کے لیے دعا مانگنے داتا صاحب کے دربار جانے کے لیے آئی تھی۔ عدالت میں اس کے بیان کے مطابق ''پولیس والوں نے مجھ سے ۱۳۰۰۰ روپے بھی چھین لیے اور میری پوری تلاشی بھی لی اور رات بھر مجھے تھانے میں قید رکھا۔''

شیخوپورہ کی ایک ۱۳ سالہ لڑکی کو ۲۰۰۰۰ روپے لے کر اور اس کے ساتھ زنا کرنے کے بعد اپنے افسر کے سپرد کر دیا۔ اس افسر نے بھی اس کے ساتھ زنا کرنے کے بعد اس شرط پر رہا کیا کہ وہ اپنے بیان سے اس پر زنا کا الزام نکال دے۔

ایک سترہ برس کی کرسچن لڑکی اور اس کی ماں کو سرگودھا پولیس نے تین دن تھانے میں مقید رکھا جس پر عیسائیوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی اور کرسچن ایم این اے جے سالک نے پولیس کے خلاف سرگودھا میں بھوک ہڑتال کی۔

سرگودھا کے ایک اے ایس آئی نے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ ایک گھر پر دھاوا بول دیا اور خاندان کی ایک خاتون کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔

گھریلو تشدد:۔

گھروں میں عورتوں پر تشدد عموماً طاقت کے استعمال سے کیا جاتا ہے، خصوصاً خاوند سے مار کٹائی۔ قریباً ۴۰۰ ظالمانہ واقعات میں سے دو سو تو پنجاب سے ہی درج کیے گئے جہاں بیویوں کو مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ بعض تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑوں میں ماری گئیں اور بعض دوسری شادی کی اجازت نہ دینے کی وجہ سے ہلاک کی گئیں اور کچھ خاوند کے حد سے زیادہ غصہ والی طبیعت ہونے کی وجہ سے غصہ میں آ کر بیوی کو ہلاک کر دیا گیا۔

ہلاک کرنے والے واقعات بعض خاندانوں میں بیوی کی اس ضد پر ہوئے کہ وہ سسرال والوں سے الگ اپنے گھر میں رہنا چاہتی ہے۔ عورت کے بدکردار ہونے کے شبہ میں اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔

خاندانی ظلم کی ایک اور صورت بھی ہے۔ کسی لڑکی کو سوتیلی ماں جائیداد کے حق سے محروم کرنے کے لیے اسے مروا دیتی ہے۔ ایسا واقعہ ایک نوجوان لڑکی سے لاہور میں

پیش آیا۔ کراچی میں ایک ماں اور بیٹی کو جائیداد سے محروم رکھنے کے لیے قتل کر دیا گیا۔ اسی سال قصور میں ایک جوان بیٹے نے ماں سے جھگڑے کی بنا پر ماں کو اتنا تنگ کیا کہ آخر ماں نے خودکشی کر لی اور رسی سے لٹک کر اپنے آپ کو پھانسی دے لی۔

اسٹوو سے جل کر مرنے والے واقعات کی ایک علیحدہ نوعیت ہے۔ اندازاً روزانہ ایک موت چولہے کی وجہ سے ہو جاتی ہے۔ پچھلے چند برسوں میں تو یہ واقعات بہت بڑھ گئے ہیں مگر اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ کبھی میاں کی کارستانی سے بیوی جلتی ہے۔ کبھی کہتے ہیں چولہے کی بناوٹ میں نقص تھا اور کبھی نئی جگہ شادی رچانے کی چاہت میں ساس، دیور اور خاوند مل کر یہ اہتمام کر لیتے ہیں۔ بعض مرنے والی لڑکیوں کے آخری بیان یہی ظاہر کرتے ہیں کہ وہ لوگ دوسری جگہ شادی رچانا چاہتے تھے، مگر ان معاملات پر کبھی دور رس نتائج نکالنے کی کسی نے کوشش ہی نہیں کی نہ ہی کبھی اسٹوو کی ساخت وغیرہ پر غور کروایا گیا کیونکہ اگر اسٹوو سے تیزی سے تیل خارج ہونا شروع ہو جائے تو کمپنی والوں سے پڑتال کروانی چاہیئے۔

جہدِ حق ستمبر ۱۹۹۶ء

خضدار............ دوسری شادی کے لیے بیوی کا قتل

۲۸ جولائی کی شب انسپکٹر پولیس خضدار فرید احمد جمالی نے اپنی بیوی کو سرکاری ریوالور سے قتل کر کے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا............ مجرم کے قریبی ہمسایوں اور دوسرے لوگوں کا موقف ہے کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا مگر اس کے بیٹوں نے اسے اجازت نہیں دی تھی۔

محمد نعیم صابر

قلات............ مرضی سے شادی کا خواہش مند جوڑا قتل کر دیا گیا

۲۸ جولائی کی سب ڈسٹرکٹ قلات کے تحصیل سوزاب میں ڈن کے مقام پر نوجوان تعلیم یافتہ منیر احمد اور ایک لڑکی کو سنگسار کر کے قتل کر دیا گیا۔ مقتولین اپنے پروگرام کے مطابق گھر سے فرار ہونے کے لیے وقتی طور پر ایک جنگل میں قریب ہی پناہ لیے ہوئے

تھے کہ لڑکی کا والد اپنے چند رشتہ داروں سمیت انہیں قابو کرنے میں کامیاب ہو گیا اور وہیں پر دونوں کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا۔

انسانی حقوق کے کمیشن کے نمائندے کو علاقے کے لوگوں نے بتایا کہ چند روز میں لڑکی کی مرضی کے خلاف اس کی شادی ہونے والی تھی۔ علاقے کی روایات کے مطابق لڑکی کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ فرسودہ روایات کے خوف سے لڑکی بولنے کی ہمت بھی نہیں کرتی۔ تحصیلدار سوراب کا کہنا ہے کہ ایسے واقعات کا ان قبائلی علاقوں میں یہی نتیجہ نکلتا ہے اور دونوں جانب کے فریق اسے علاقائی روایات کا حصہ قرار دے کر کسی قسم کا مقدمہ نہیں لڑنا چاہتے۔ لڑکی کے والد کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور کیس عدالت میں پیش کیا جائے گا۔

پشاور............''غیرت مند'' بیٹوں کے ہاتھوں ماں کا قتل

۶ اگست کو ہشت نگری پولیس پشاور نے ایک محلے سے مخبری پر ۳ عورتیں اور چار مرد گرفتار کر لیے۔ ان سب پر الزام تھا کہ یہ جسم فروشی کا کام کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک چالیس سالہ خاتون گلاب زری سکنہ نمک منڈی پشاور، جب رہا ہو کر صدر پشاور کے علاقے میں جا رہی تھی تو اس کے دو بیٹوں نے گولیاں مار کر ماں کو قتل کر دیا۔ بعد ازاں خود گرفتاری پیش کر کے انہوں نے یہ بیان دیا کہ وہ رسم و رواج کو پورا کر کے والدہ کے قاتل بنے۔ ہماری سوسائٹی میں غیرت کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ والدہ کی بدنامی کے بعد وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے۔

یحییٰ احمد

جیکب آباد............دو عورتوں کا اغواء اور ایک مرد کا قتل

۱۹ جولائی ۱۹۹۶ء کی شام جیکب آباد کے اسٹیشن پر ''ہزاروں بتھانی بلیدی'' نے پستول سے فائرنگ کر کے ایک شخص مہر علی کو قتل کر دیا۔ قتل کی وجہ یہ ہے کہ مقتول پر الزام تھا کہ اس نے ایک سال پہلے ''ہزاروں بلیدی'' کی دو بہنوں کو اغوا کروایا تھا جبکہ مقتول مہر علی لہڑی، اس اغوا کی تردید کرتا رہا تھا۔ ہزاروں بلیدی نے اس کے خلاف اغواء کی رپورٹ بھی درج کروائی تھی مگر مہر علی لہڑی، علاقے کے بااثر آدمی ہونے کی وجہ سے پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

تھری میرواہ............ کاروکاری کے الزام میں لڑکی کا قتل

مسمات فتح خاتون (اعوان) کو ایک نوجوان جعداد جدوار سے پرانے تعلقات کے شبہ میں وحشی عزیزوں نے بے دردی سے قتل کر دیا۔ مقامی ڈاکٹر نے پہلے تو غیر سرکاری طور پر بتایا کہ لڑکی کی موت تشدد سے ہوئی ہے مگر ایک اطلاع کے مطابق ڈاکٹر نے پچاس ہزار رشوت لینے کے بعد قتل کو خودکشی کا رنگ دے دیا ہے۔

جبکہ جعداد جدوار کو بھی شدید زخمی حالت میں میرواہ پولیس کے حوالے کیا گیا ہے۔ جس نے اسے ہسپتال داخل کرایا ہے جہاں وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ دوسری طرف اعوان برادری اور جدوار برادری میں جھگڑا بڑھنے کا اندیشہ ہے۔

گلشن علی

خیبر ایجنسی............ علاقہ تیراہ میں وٹہ سٹہ کا رواج اور لڑکیوں کی مرضی کے بغیر خرید وفروخت

علاقہ میں شادی کے لیے ایک جرگہ ہوتا ہے جب ایک لڑکے کے لیے لڑکی کا رشتہ مانگنا ہوتا ہے تو یہ جرگہ لڑکی کے ہاں جاتا ہے اور لڑکی کے والد سے رقم طے کرتا ہے جو عموماً چھ سے چالیس ہزار پاکستانی ہوتے ہیں۔ جرگہ کی واپسی پر اسے دنبہ یا دنبے کی قیمت کے برابر نقد رقم دی جاتی ہے۔

اس دوران لڑکی کی رضا مندی معلوم کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ یہ روپے والد کو دیئے جاتے ہیں۔ اگر وٹہ سٹہ کرنا ہو تو رقم کم ادا کرتے ہیں۔

اس میں بھی لڑکی کی مرضی کے متعلق لڑکی سے معلوم کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

اس کے علاوہ علاقہ میں لڑکیوں کے لیے کوئی تعلیمی ادارہ موجود نہیں۔

لڑکے مسجدوں میں درس میں حصہ لیتے ہیں جو لڑکے سرکاری سکول میں داخلہ لینا چاہتے ہیں تو سرکاری سکولوں میں داخلہ نہیں ملتا کیونکہ تاریخ پیدائش اور رجسٹریشن کا مسئلہ ہوتا ہے اور وہ مزید تعلیم حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

پاکستان کا یہ ۱۴ سو کلو میٹر سرحدی علاقہ موجودہ دور میں ملک کے لیے بہت بڑا

مسئلہ بن چکا ہے۔ طورخم پر صرف ایک پھاٹک ہے۔ طورخم سے چترال تک اور وزیرستان تک یہ سرحدی علاقہ کھلا پڑا ہے اور ہر قسم کا غیر قانونی دھندہ یہاں پر ہو رہا ہے۔

ایک قبائلی آفریدی
تحصیل باڑہ

لیاقت پور............ طالبہ کے اغوا کی ناکام کوشش

لیاقت پور اور اس کے مضافات میں اٹھائی گیروں کا منظّم گروہ بچوں، نوجوانوں اور خواتین کو اغواء کرنے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ اس گروہ کے ارکان مختلف حیلوں سے راہ جاتے شکار کو موٹر سائیکل یا کار پر لفٹ دیتے ہیں۔ پھر جائے واردات سے غائب ہو جاتے ہیں۔ جونہی طلباء طالبات سکول سے باہر آتے ہیں تو یہ انہیں نشہ آور ٹافیاں اور چاکلیٹ پیش کرتے ہیں اور انہیں بہلا پھسلا کر گاڑی میں ڈال کر غائب ہو جاتے ہیں۔ چک نمبر ۲۲ عباسیہ کے گرلز پرائمری سکول کے باہر اس گروہ کے ارکان کھڑے تھے جونہی طالبات باہر آئیں تو انہوں نے حسب معمول بچیوں کو ٹافیاں دینی شروع کیں۔ لیکن طالبات نے شور مچانا شروع کر دیا۔ انہوں نے محمد صدیق نامی شخص کی کم عمر لڑکی کو پکڑ لیا۔ لیکن طالبات کے مسلسل شور مچانے پر چھوڑ کر بھاگ گئے۔

لیاقت پور............ وٹہ سٹہ۔ قتل۔ راضی نامہ

ترنڈہ محمد پناہ کے نواحی موضع غازی پور کے محمد عاشق کی شادی وٹہ سٹہ کی رسم کے مطابق احمد پور شرقیہ کے منظور احمد کی بہن فیض مائی سے ہوئی جبکہ محمد عاشق کی بہن نسیم بی بی کے ساتھ منظور احمد کا عقد ہوا۔ کچھ عرصہ قبل نسیم بی بی اپنے خاوند سے گھریلو اختلافات کی وجہ سے غازی پور آ گئی۔ وقوعہ کے روز فیض مائی نے تلخ کلامی کے بعد پختہ اینٹ نسیم بی بی کے پیٹ پر ماری۔ جس سے وہ زخموں کی تاب نہ لانے پر موقع پر جاں بحق ہو گئی۔ ترنڈہ محمد پناہ پولیس نے فیض مائی اور اس کے خاوند محمد عاشق کے خلاف ۳۴/ ۳۰۲ کے تحت مقدمہ درج کر کے جیل بھجوا دیا۔ ملزمان محمد عاشق اور اس کی بیوی فیض مائی نے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ سیشن جج لیاقت پور فیض ربانی خان سیال کی عدالت میں ضمانت بعد از گرفتاری کی اپیل دائر کی جس پر فاضل عدالت نے فریقین میں راضی نامہ ہونے کی وجہ سے بیان حلفی کی روشنی میں

پچاس ہزار کی ضمانت یا مچلکہ پر عبوری ضمانت منظور کی۔

منظور احمد سیال

خیر پور............ ''بدچلن'' بیوی کا قتل

۸ ستمبر ۹۶ء تھانہ احمد پور کی حد میں پیرل جاکرانی نے اپنی ۳۸ سالہ بیوی ظہوراں کو کاری کر کے قتل کر دیا۔ پیرل جاکرانی کو شک تھا کہ اس کی بیوی کے بہت سے غیر مردوں کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔ پیرل جاکرانی کے مطابق وقوعہ کے روز بھی وہ قابل اعتراض حالت میں دیکھی گئی تھی جس پر اس نے کلہاڑی کے وار کر کے اسے قتل کر دیا اور فرار ہو گیا۔ بعد ازاں پولیس نے مقدمہ درج کر کے ملزم کو گرفتار کر لیا اور تحقیقات شروع کر دی۔

خیر پور.................. طلاق نہ دینے پر شوہر کا قتل

مورخہ ۹ ستمبر ۹۶ء کوٹ ڈیجی تھانہ کی حدود میں مسماۃ لعل خاتون نے اپنے بھائی سکندر اور باپ نہال کے ساتھ مل کر اپنے شوہر عبدالرزاق کو جو خیر پور میں پولیس ہیڈ کانسٹیبل تھا، ہلاک کر دیا۔ عبدالرزاق کے بھائی عبدالکریم نے بتایا کہ ملزمہ طلاق لینا چاہتی تھی اور میرا بھائی اسے چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ پولیس نے مقدمہ درج کر لیا ہے۔

نواب شاہ........... دو عورتوں کی خودکشی

یکم ستمبر ۹۶ء کو ایک ہی طرح کے واقعات میں دو عورتیں ہلاک ہو گئیں۔ پہلا واقعہ لائن پار نواب شاہ کے علاقے میں خوشی محمد آرائیں کی بیوی ثریا ہلاک ہوئی۔ شک کی بنا پر پولیس نے خوشی محمد آرائیں کو حراست میں لے کر تفتیش شروع کی۔ تفتیش کے دوران خوشی محمد آرائیں نے بتایا کہ ثریا اس کی دوسری بیوی تھی جبکہ پہلی بیوی کو وہ طلاق دے چکا تھا لیکن ثریا کو شک تھا کہ وہ طلاق کے باوجود پہلی بیوی سے ملاقاتیں کرتا ہے۔ اس بات پر اکثر تنازعہ رہتا تھا جس پر ثریا نے زہریلی دوا پی کر خودکشی کر لی۔ پولیس نے اتفاقی کارروائی کے نتیجے میں مقدمہ درج کر لیا ہے۔ دوسرا واقعہ ہاؤسنگ سوسائٹی کے علاقہ میں ہوا۔ گھریلو تنازعہ کی بنا پر تین بچوں کی ماں مسماۃ ممتاز ڈیٹھا پر اسرار طریقہ سے ہلاک ہو گئی۔ پولیس نے شک کی بنا پر اس کے شوہر جاوید ڈیٹھا کو گرفتار کر لیا۔ پولیس نے تفتیش کے دوران

HRCP کے کارکنوں کو بتایا ہے کہ مسماۃ ممتاز ڈیٹھا نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کی ہے جس کا سبب گھریلو ناچاقی تھی اور اکثر دونوں میں تنازعہ رہتا تھا۔

مسعود احمد بزمی

کوئٹہ............عورت گوشت نہیں کھا سکی

بلوچستان میں اب بھی ایسے علاقے ہیں جہاں لوگ پتھر کے زمانے کی طرح غاروں میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور عورت کو غلام سمجھ کر اس سے مشقت لی جا رہی ہے۔ ان علاقوں میں ایک علاقہ ڈیرہ بگٹی ہے۔ جہاں آج بھی خواتین کے لیے گوشت کھانے پر پابندی ہے۔ ڈیرہ بگٹی سے تعلق رکھنے والی ممتاز خاتون سماجی کارکن گل نور بگٹی نے HRCP کے نمائندے کو بتایا کہ ڈیرہ بگٹی کے بعض علاقوں میں مردوں نے خواتین کے لیے گوشت کھانے پر اس لیے پابندی برقرار رکھی ہے کہ عورت کے لیے گوشت کھانا قبائلی روایات کے خلاف ہے بلکہ بعض مردوں کا خیال ہے کہ گوشت کھانے سے عورت طاقت ور اور دلیر ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے مردوں کے لیے بنائی جانے والی قبائلی روایات سے بغاوت کا خطرہ ہے۔ مردوں نے ان خواتین کے ذہنوں میں یہ خوف بھی ڈالا ہے کہ اگر کسی خاتون نے گوشت کھایا تو وہ ذہنی اور جسمانی طور پر معذور ہو جائے گی۔

بچوں پر تشدد:۔

بچوں پر تشدد کا مسئلہ نہایت نازک نوعیت کا ہے۔ بچوں کو مارنے پیٹنے کی بات ہی الگ ہے۔ یہ بدنی تشدد کم وبیش ہر جگہ روا رکھا جاتا ہے۔ معاشرہ مغربی ہو یا مشرقی، بگڑے بچوں پر چھڑی نہ استعمال کرنا ان سے دشمنی کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ ڈنڈا پیر ہے ''بگڑے تگڑوں کا۔'' بچوں کی زندگی کی ابتدا میں ہی تشدد کسی حد تک مضمر ہوتا ہے اور یہ تشدد تعلیم و تربیت اور زندگی کے اوسان عطا کرنے کے لیے ہوتا ہے خطا کرنے کے لیے نہیں ہوتا لیکن عموماً بچوں کو اس بہانے بعض اوقات شدید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ہم اس باب میں اس تشدد کے حوالے سے کم ہی بات کریں گے۔ تشدد کی اور اقسام جو بچوں پر روا رکھی جاتی ہیں ان کا ذکر اور ان پر غور وفکر بہت ضروری ہے۔ اگلی پود اور اگلی نسل کا تحفظ اور ان کی صحت مندانہ پرورش ہر مہذب معاشرے کی اولین ضرورت ہوتی ہے اور ہونی چاہئے۔

ماں باپ کے تعلقات براہ راست بچوں کی ذہنی اور اخلاقی نشوونما پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ خاندان کے حالات چاہے وہ غربت کی بنا پر ہوں کہ اضطراب اور تشویش کے ماحول کی وجہ سے، ماں باپ کی باہمی کشمکش اور باہمی نفرت بچوں کی صحت پر مضر اثرات مرتب کرتی ہے۔ غیر تسلی بخش ازدواجی زندگی بچوں کے لیے مہلک اثرات رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ خاندان کے معاشی اور معاشرتی حالات بھی ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بچوں سے جبری مشقت، محنت مزدوری اور ملازمت کروانا بچوں کو مجبور کرنا کہ وہ کھیل کود اور پڑھائی لکھائی چھوڑ کر معاشرت میں بڑوں کے ساتھ ہاتھ بٹائیں...... یہ سب سے بڑا تشدد کا ہتھیار ہے جو پس ماندہ اور ترقی پذیر ملکوں میں نئی پود اور نئی نسل پر دو دھاری تلوار کی صورت میں چلایا جا رہا ہے۔ بچوں سے کم نرخوں پر محنت مزدوری کرواؤ۔ ان کو تعلیم سے بھی محروم رکھو اور جو نوجوان نسل ہے، جو نوکری اور ملازمت کی تلاش میں ہر آن سرگرداں پھرتی رہتی ہے اور اضطراب میں مبتلا ہے اس کو بے روزگار رکھو۔ بچوں سے سستا کام لو، بڑوں کو مہنگا آرام دو۔ تاکہ وہ کسی کام کے نہ رہیں۔ نہ گھر کے نہ گھاٹ کے! دونوں پہلوؤں سے ناخواندگی اور بے روزگاری دن بدن بڑھ رہی ہے۔ بچوں کو قالین اور کھیل کے سامان کے لیے وقف کر دو۔ انہیں نہ پڑھاؤ اور آدھا روزگار ان کے وسیلے سے کما لو۔ ''اقتصادی جواز'' آپ اگر بچوں کی ملازمت کے ڈھونڈنے چاہیں گے تو وہ بھی بہرحال آپ کو مل جائیں گے۔ ''انسانی ضمیر'' کو ایسے کام کرنے آتے ہیں اور اس طرح کے فتوے گھڑنے آتے ہیں۔

بچوں پر تشدد کے مختلف پہلوؤں کو مندرجہ ذیل نکات کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، تاکہ اس مطالعے کی غیر ضروری طوالت کو ہر ممکن طور پر کم کیا جا سکے!

☆ وہ تشدد جو بچوں پر ناکام ازدواجی زندگی کے باعث ہوتا ہے۔ طلاق کے بعد ماں یا باپ اکیلے ان کا موزوں طور پر خیال نہیں رکھ سکے۔ یا پھر وہ دوسرے رشتہ داروں کے ہاں محرومی کی فضا میں پرورش پاتے ہیں اور ذہنی اور جذباتی طور پر مجروح ہو جاتے ہیں۔

☆ لاوارث بچوں پر تشدد لازمی عنصر ہے۔ معاشرہ ہر طرح ان سے ناانصافی کا سلوک دیدہ دانستہ یا غیر شعوری طور پر روا رکھتا ہے۔ اس کا بے دریغ استعمال ہوتا ہے۔ یہ تشدد ذہنی، جذباتی، اقتصادی اور جسمانی ہر طرح ہوتا ہے۔

☆ بہت بڑی تعداد بچوں کی اغوا ہو کر بیگار کیمپوں میں محنت مزدوری کرتے ہوئے گمنام ماحول میں جوان ہوتی ہے۔ ان بچوں کی تعداد ہمارے جیسے ملکوں میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہوتی ہے۔ یہ بچے یا تو ذہنی طور پر مفلوج ہو جاتے ہیں یا پھر اس لاوارثی کے دور میں جرائم پیشہ اداروں کے ہاتھ لگ جاتے ہیں اور ''تشدد'' کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ معاشرہ جو کچھ بوئے گا وہی کاٹے گا! تشدد کی فصل سے تشدد ہی حاصل ہوگا۔ ہمارے معاشرے میں ان بچوں کی صورت لاتعداد ذہنی اور نفسیاتی مریض پرورش پا رہے ہیں اور اس وجہ سے بھی ہمارے معاشرے میں طرح طرح کے جرائم پھیل رہے ہیں اور نشہ آور ادویات کا فروغ ہو رہا ہے۔ دوسری طرف اضطراب، تشویش، غم و غصہ اور اشتعال دن بدن معاشرے میں ایک طوفان کی صورت میں امڈ آئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں مہلک ہتھیاروں اور جدید خطرناک اسلحہ جات کی تجارت زوروں پر ہے۔ گلی گلی ہر شہر اور قصبے میں کھلے بندوں اسلحہ کی دکانیں کھل گئی ہیں۔

☆ تشدد کی ایک صورت متمول گھرانوں کا موجودہ ماحول ہے۔ جہاں اقتصادی وسائل کی کمی نہیں۔ مال و دولت اور آسائشوں کی ریل پیل ہے لیکن ماں باپ کی ناجائز اور حد سے بڑھی ہوئی مصروفیات کے باعث بچوں میں تنہائی، مایوسی، لاحاصلی اور بے راہ روی فروغ پا رہی ہے۔ بچے اپنی ناہموار تربیت کے باعث سخت اضطراب اور تشویش میں مبتلا ہیں۔ ان میں اسی لیے تشدد کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ''مغربی میڈیا'' ان کو تشدد کے جدید وسائل اور ہتھیاروں سے خوب مانوس کر دیتا ہے۔ ویڈیو گیمز اور فلمیں اور ڈش سب کچھ انہیں سکھا دیتے ہیں۔ پھر وہ اپنے اپنے ''گروہ'' بنا کر محض ''لذت کوشی'' اور جذبہ انتقام کی صورت میں قتل و غارت کرتے ہیں اور ڈاکے ڈالتے پھرتے ہیں اور لوٹے ہوئے مال و متاع سے سخت بری عادتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور معاشرے کے لیے مجسم ''ناسور'' بن جاتے ہیں۔

عام بچوں پر تشدد کے سلسلہ میں ہیومن رائٹس کمیشن نے جو اطلاعات فراہم کی ہیں، ان میں سے کچھ نمونہ کے طور پر آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

جہد حق۔ نومبر ۱۹۹۶ء

محنت کش بچے

بچوں کی ایک بڑی تعداد اس وقت بڑوں کا بوجھ اٹھانے میں شریک ہے۔ بے روزگاری کے ماحول میں ان بچوں کو صرف اس لیے کام مل جاتا ہے کیونکہ یہ بڑوں کی نسبت کم اجرت میں کام کرتے ہیں۔ جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ پاکستان میں لیبر ایکٹ کے تحت ایک مزدور کی کم سے کم تنخواہ ۱۶۵۰ روپے ہے جبکہ بچوں کو عام طور پر مختلف کاموں کے لیے تین سو سے لے کر ۷۰۰ روپے دیئے جاتے ہیں جبکہ اکثر ورکشاپوں، فیکٹریوں اور گھروں میں کام کرنے والے بچوں کو اس سے بھی معمولی اجرت کے عوض کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں یہ بچے ہفتے میں ۵۵ سے ۶۵ گھنٹے کام کرتے ہیں جبکہ دنیا بھر میں ایک صحت مند آدمی ہفتے میں ۴۰ گھنٹے تک کام کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ناقص اور خطرناک ماحول میں گھنٹوں کام کرنے کی وجہ سے اکثر بچے مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی شونما متاثر ہوتی ہے، ان کی بینائی، گردوں اور پھیپھڑوں پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اسی لیے یہ کم عمر بچے اکثر بارہ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔

میر پور خاص............۱۴ سالہ لڑکا اغوا

کوٹ غلام محمد سے ۹۶-۹-۱۳ کو سپاہی ریاض قائم خانی اور اس کے دوست جھنڈو خاص خیلی نے ۱۴ سالہ ہندو لڑکے راؤ مل ماٹھی کو زبردستی اغواء کر لیا۔ راؤ مل کے گھر والوں نے تھانہ کوٹ غلام محمد پر راؤ مل کی گمشدگی کی اطلاع دی۔ SHO کوٹ غلام محمد نے شہریوں کی نشاندہی پر ساماروضلع عمر کوٹ کے ایک گھر سے راؤ مل کو برآمد کر کے والدین کے سپرد کیا۔ ڈی ایس پی ڈگری نے کارروائی کرتے ہوئے سپاہی ریاض قائم خوانی کو معطل کر کے لاک اپ کر دیا ہے جبکہ دوسرا ملزم جھنڈو خاص خیلی اب تک پولیس سے روپوش ہے۔

نواب شاہ............ ۹ سالہ بچی کا قتل

پنوں عاقل میں درندہ صفت ملزمان نے قتل کے انتقام میں ایک ۹ سالہ بچی مسمات راضی کو بجلی کے کرنٹ لگا کر ہلاک کر دیا۔ پولیس کے مطابق مذکورہ واردات کسی بدلے کا شاخسانہ تھی۔ پنوں عاقل پولیس نے سات ملزمان کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی ہے۔

خضدار............ معصوم بچوں کا قتل

۱۰ اکتوبر اور ۱۱ اکتوبر کی درمیانی رات ڈیڑھ بجے کے قریب چند مسلح نقاب پوش افراد کھنڈ میں واقع ایک شخص غلام نبی کے گھر میں داخل ہوئے اور فائرنگ کر کے ماں کی آغوش میں سوئے ہوئے دو سالہ دودھ پیتے بچے عبدالنبی اور سات سالہ بچی مراد بی بی کو ہلاک کر دیا جبکہ چار سالہ اسماء بی بی اور پندرہ سالہ رحمت اللہ شدید زخمی ہو گئے۔ قتل کی وجہ پرانی دشمنی بتائی جاتی ہے۔

ملزمان بچوں کے باپ کو قتل کرنے آئے تھے جو کہ ایک شادی میں شرکت کرنے ایک قریبی گاؤں گیا ہوا تھا۔ ملزمان کے گھر میں داخل ہو کر بچوں کے قریب سوئے ہوئے شخص کے چہرے سے چادر ہٹائی تو وہ بچوں کا ماموں نکلا جو غلام نبی کی عدم موجودگی میں اس کے بچوں کے ہاں سویا ہوا تھا۔ ملزمان واپس مڑ کر شاید جانے ہی والے تھے کہ بچوں کی ماں کی آنکھ کھل گئی اور اس نے ملزمان کو للکارا کہ کون ہے؟ جس پر بے رحم ملزمان نے ماں کے جگر گوشوں کو اس کے سامنے ہی فائرنگ کر کے ۲ کو ہلاک کر دیا جبکہ ۲ شدید زخمی ہو گئے۔

۱۹۹۳ء میں حقوق انسانی کی پاکستان میں حالت

(رپورٹ ۱۹۹۳ء صفحہ ۶۴)

بچوں سے مشقت:

پاکستان میں بچوں سے مشقت، سرکاری اعداد و شمار کے لحاظ سے ایک بڑا مسئلہ

ہے۔ سرکاری اندازے کے مطابق چودہ (۱۴) برس سے کم عمر کے بچوں سے مشقت لینے کی تعداد ۶۰ لاکھ ہے۔ مگر دراصل ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ قریباً ملک کی ساری مزدور آبادی کا چالیسواں حصہ مشقتی بچوں کا ہے جو کہ تقریباً ایک کروڑ ۶۵ لاکھ بنتا ہے۔ حکومت کے اپنے دفتری اندازوں کے مطابق سکولوں میں داخلوں کے اعداد اور دوسری مختلف فہرستوں کے مطابق مشقتی بچوں کی ۱۴ کروڑ آبادی میں سے بہت سے بچوں کو اجرت بھی نہیں ملتی۔

پاکستان میں کم از کم دس لاکھ بچے ۱۲ برس کی عمر تک کے ایسے ہیں جو قالین بانی، کپڑوں کی فیکٹریوں میں کپڑا بننے کا کام، گاڑیوں کی ورکشاپ میں اندھا دھند کام، پٹرول پمپوں پر اور مچھلی خانوں میں گھنٹوں کام کرتے ہیں۔ صرف کراچی ہی میں چھوٹی عمر کے مشقتی بچوں کی تعداد ۵ لاکھ ہے جن میں سے ۲۵۰۰۰۰ تو قالین بانی کا کام کرتے ہیں۔ پنجاب، جو کہ قالین بانی کا مرکز خیال کیا جاتا ہے وہاں یہ چھوٹے بچے بارہ لاکھ سے بھی زیادہ تعداد میں کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے کاموں میں مثلاً لانڈری، فاؤنڈری، تعمیراتی کام اور اینٹیں بنانے کے کام شامل ہیں۔ ان خاص خاص کاموں کے علاوہ دوسرے کام مثلاً چھوٹے قہوہ خانے یا کھانا وغیرہ پکانے کی دکانیں، چھوٹے ہوٹل، لکڑی پر کام کرنے والے اور درزیوں کے اڈوں پر سلائی کرنے، جوتے بنانے اور بیکریوں میں بھی ہزاروں بچے کام کرتے ہیں۔

حال ہی میں امریکی کانگریس نے ان ممالک سے جہاں بچوں سے کام لیا جاتا ہے، قالین منگوانے پر پابندی عائد کر دی تھی مگر تاجر لوگوں نے واویلا مچایا اور اس بات سے انکار کیا کہ وہ بچوں سے کام لیتے ہیں۔ تاجروں کے ایک نمائندے نے کہا کہ ہمارے پاس کام کرنے والے کسی بچے کو پھیپھڑوں کی بیماری نہیں ہوئی اور ہم ان کا اور ان کی صحت کا خوب خیال رکھتے ہیں۔ انہیں کافی مقدار میں شکر مہیا کرتے ہیں جس سے پھیپھڑوں کی کوئی بیماری نہیں ہوتی۔ ایک امریکی وفد کو ملک میں بلا کر معائنہ کرنے کی دعوت بھی دی تا کہ وہ خود تصدیق کر لیں۔

اس سال کسی بھی ادارے نے بچوں سے مشقت لینے پر اور Child Employment ایکٹ ۱۹۹۱ء کی خلاف ورزی رپورٹ نہیں بھیجی۔ قانون کے مطابق

مشقت کے لیے عمر کا تعین ۱۴ برس سے ۱۶ برس کیا گیا تھا۔ یہ کان کنی اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے بچوں کے لیے تھا جسے (Abolition Act 1992) کہتے ہیں۔

قصور کی ایک قالین باف فیکٹری کے خلاف سپریم کورٹ کے فل بنچ نے ایک عرض داشت کی سماعت کی اور فیصلہ سنایا کہ قانون کی خلاف ورزی کی گئی ہے بچوں سے مشقت لی جا رہی ہے۔

بچے:

آبادی......۱۹۹۳ء میں پاکستان کی آبادی اندازاً ایک سو بیس ملین ہو گئی تھی جن میں سے آدھی آبادی سے زیادہ یا چونسٹھ ملین لوگ اٹھارہ برس سے کم عمر کے تھے۔ جن میں سب سے زیادہ چار سالہ بچوں سے کم عمر بچوں کا گروپ ۱۸۴۸ملین اور ۵۰۹ ملین ۱۹۰۲ ملین۔ اس کے بعد دس اور چودہ برس والے بچوں کا تناسب ۱۵۰۸۴ملین اور ۱۰۸ملین تھا۔

پاکستان میں بچوں کی شرح اموات دنیا میں سب سے زیادہ ابتر رہی سوائے ہندوستان، چین اور نائجیریا کے۔ قریباً ۲۳۰۰۰۰ بچے ا/ برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی مر گئے۔ پانچ برس کی عمر تک کے بچوں کی اموات کا اندازہ ۴۰۰۰۰۰ اسال کے دوران ہے۔

لڑکیوں کی شرح اموات لڑکوں سے کہیں زیادہ رہی اسی لیے لڑکے لڑکیوں کی آبادی کا تناسب، پاکستان میں آہستہ آہستہ تبدیل ہوتا گیا ہے اور ۱۰ سے ۱۸ سال تک کے بچوں کے گروپ تک پہنچتے پہنچتے لڑکیوں کی آبادی نمایاں طور پر لڑکوں کی نسبت کم ہو گئی ہے۔

صحت:

زیادہ تر بچوں کی اموات خسرا کی بیماری سے ہوئی، ایک لاکھ ستر ہزار (۱۷۰۰۰۰)۔

اور سانس کی بیماری سے اسی ہزار اموات ہوئیں! ان دو بیماریوں اور اسہال کی بیماری سے ٪۶۰ اموات ہوئیں۔ موسمی بیماریوں سے بھی اپنے اپنے علاقوں کے موسم کے مطابق بچوں کی اموات ہوئیں۔ جیسے کہ کراچی اور دیگر گرم موسم والے علاقوں میں ملیریا

وغیرہ یا پھر چترال اور شمالی علاقہ جات میں سردی سے نمونیہ وغیرہ کی بیماریاں۔

بچوں کی صحت میں غذائیت کی کمی، موت یا اپاہج ہونے کا اس ملک میں بڑا سبب ہے۔ بچوں کی آبادی کا ۴۰ فیصد حصہ غذا کی کمی کا شکار ہو جاتا ہے یا پانچ برس کی عمر کے تقریباً ۹۰ لاکھ بچے مناسب غذا سے محروم ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ پاکستان میں بھوٹان جیسے ملک سے بھی ان کی شرح زیادہ ہے۔ یہاں ۳۸ فیصد ہیں اور سری لنکا سے تو اور بھی پیچھے ہیں جہاں شرح ۲۹ فیصد ہے۔

مارکیٹ میں ایک درجن سے بھی زیادہ Antibiotic دوائیاں، بھوک بڑھانے والی دوائیاں اور دماغی قوت بڑھانے والی ایسی دوائیاں موجود ہیں مگر لوگ چھوٹی چھوٹی تکلیف میں بھی ایسی تیز اور تکلیف بڑھا دینے والی دوائیاں معمولی باتوں کے لیے استعمال کروا دیتے ہیں جیسے کہ اسہال، سانس کی تکلیف، معمولی بخار وغیرہ اور جن کے لیے ہلکی اور جلد اثر کرنے والی دوائیاں دی جا سکتی ہیں۔

(EIP) یہ چھ ایسی بیماریاں ہیں جن سے بچوں کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ ۱۹۹۳۔۱۹۹۲ تک دستیاب نہیں تھیں۔

اغواء:

بڑے بڑے جرائم میں اغوا کا جرم شامل ہے۔ صرف پنجاب میں اغوا کی وارداتوں کی تعداد ایک ماہ میں چار سو (۴۰۰) ہے جن میں تقریباً آدھے کیس تو سال بھر میں بغیر کسی نتیجہ کے ہی رہ گئے۔ ان کا کچھ سراغ نہ مل سکا۔ سراغ ملنے کی اوسط گرتی چلی گئی ہے جبکہ پچھلے دو برسوں میں ۶۰ فیصد تھی۔ پچھلے ڈھائی سال میں اغواء ہونے والے ان بچوں کی تعداد ۴۰۰۰ ہو گئی جن کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

اغوا کرنے کا ایک مطلب تو ان بچوں سے مشقت لینا ہے۔ مثلاً اغوا کئے ہوئے بچے جو ملک کے مختلف حصوں سے ملے ان سے کھانے پینے اور جلانے کے سامان کو افغان بارڈر کے پار پہنچانے کا کام لیا جاتا تھا۔

ایک مذہبی سیاسی جماعت کے قبضے سے پانچ اغوا شدہ بالغ بچے برآمد ہوئے جنہیں افغانستان کے جہاد کے نام پر اغوا کر کے کراچی کے ایک کیمپ میں رکھا ہوا تھا۔ انہیں

بنوں پہنچایا جاتا اور پھر جماعت کے مرکز میران شاہ پہنچایا جاتا جو کہ بارڈر کے عین قریب ہے اور جہاں سے نشہ آور مواد کی سمگلنگ ہوتی ہے۔

کراچی میں کچھ سکول کے بچوں کو اغوا کرتے ہوئے بچوں کی چیخ نے اس سارے دھندے کا راز فاش کیا۔ مرکز میں بچوں کا معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ سب کا ایک ایک گردہ نکال لیا گیا ہے۔

ظلم:

بچوں کے ساتھ ظلم کے کئی طریقے رائج ہیں۔ شالیمار باغ کے قریب ایک قصبے عالیہ کی ایک مسجد میں ایک نقشبندی عالم نے پچاس سے بھی زیادہ بچے پابہ زنجیر قید کر رکھے تھے۔ یہ بچے قرآن مجید پڑھنے آتے تھے اور یوں زنجیروں میں رکھ کر انہیں قرآن مجید پڑھایا جاتا تھا۔ شہر چونیاں میں ایک جھگڑے میں ایک پانچ سالہ بچے کو قتل کر دیا گیا اور ایسے ہی ایک واقعہ کی بنا پر لاہور میں ایک تین سالہ بچے کو قتل کر دیا گیا۔ منگورا میں ایک چار سالہ لڑکی کو اس کی سونے کی بالیوں کے لالچ میں قتل کر دیا گیا۔

بچوں سے وہ چھوٹی چھوٹی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں ان کو سدھارنے کی ابھی تک کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ بچوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے کہ وہ ایسی غلطیاں نہ کریں اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ لاہور میں ۱۸ مئی ۱۹۹۶ء کو ایک سات برس کا بچہ ہتھکڑیاں لگائے عدالت میں پیش کیا گیا مگر سٹی مجسٹریٹ کے نہ ہونے سے اسے انارکلی پولیس اسٹیشن میں بند کر دیا گیا۔ بچوں کو عموماً بڑوں سے علیحدہ کوٹھریوں میں نہیں رکھا جاتا۔ نہ ہی بچوں کے لیے کوئی علیحدہ عدالتیں موجود ہیں۔ نہ ہی کوئی ایسا ادارہ جیل والوں نے بنایا ہے جو بچوں کی ٹھیک تربیت کرے۔

بہاولپور میں اپنی نوعیت کا ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک چودہ سالہ لڑکے شہزاد کو عدالت نے ۳۰ سال قید کی سزا سنائی۔ اسے بہاولپور جیل میں ۱۹۸۹ء فروری میں بھیجا گیا تھا۔ لڑکے یا اس کے والدین کو عدالت کا فیصلہ تک مہیا نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ جیل حکام کے پاس بھی سزا یافتہ کے کسی قصور کا کاغذ پر چھپا ہوا الزام موجود نہیں تھا۔ سزا کے حکم کے ساتھ یہ بھی حکم صادر کیا گیا تھا کہ اس کے خلاف کسی قسم کی اپیل نہیں ہو سکتی۔ لاہور ہائی کورٹ

نے فیصلہ دیکھا تو ضرور مگر زیادتی ماننے کے باوجود کسی قسم کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔

بچوں کا اغوا اور تجارت:

حکومت دبئی نے عوام کی تحریک اور احتجاج کے بعد بچوں سے مشقت لینے اور اونٹوں کی دوڑ میں ان کے استعمال کرنے پر برائے نام پابندی لگا دی مگر اس کے باوجود ایسے برے کام چلتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک رپورٹ کے مطابق سکھر سے نو بچے اغوا کر لیے گئے اور اسی طرح روہڑی سے دس بچے صرف ایک مہینے میں اغوا ہوئے۔ ایک شخص پکڑا گیا وہ ایک مدہوش بچے کو اٹھائے لیے جا رہا تھا۔ سوات کے رہنے والے ایک شخص کو مناواں میں اس وقت پکڑ لیا گیا جب وہ ایک چار سالہ بچے کو اغوا کر رہا تھا۔ اس نے انکشاف کیا کہ وہ ایک سمگلروں کے گروہ کو ایسے بچے سپلائی کرتا ہے۔ وہ بچے مشرق وسطیٰ بھیجے جاتے ہیں۔

کراچی میں ایک خوفناک گروہ کی نشاندہی ہوئی جو پنجاب کے مختلف علاقوں میں چھوٹی لڑکیوں کو پیشہ وارانہ جگہوں میں اور چھوٹے لڑکوں کو فقیروں کے گروہ کے پاس بیچتے تھے۔ لڑکی کی قیمت ۲۵۰۰۰ روپے سے ۵۰۰۰۰ روپے تک اور لڑکے کی قیمت ۱۰۰۰۰ سے ۳۰۰۰۰ روپے تک وصول کرتے تھے۔ یہ تجارت پچھلے ۳۵ برس سے چل رہی تھی۔

صرف پندرہ روز میں چولستان سے ۴۵ بچے عرب امارات سمگل کیے گئے۔ اس کا راستہ تبدیل کر لیا گیا اور بلوچستان سے افغانستان کی طرف راستہ اختیار کیا۔

زنا اور بدکاری:

بچوں سے زیادتی اور بدکاری کے واقعات زیادہ تر پوشیدہ ہی رہتے ہیں۔ اسی لیے یہ حادثات بڑھتے ہی گئے اور قانون کی زد میں عموماً نہیں آ سکے۔

راولپنڈی کے ایک واقعہ میں دس سالہ لڑکے کے ساتھ زیادتی کی گئی۔ زیادتی کرنے والا مشہور عالم دین تھا اور یہ واقعہ عین مرکز ''ادارہ ختم نبوت'' میں ہوا۔ اس واقعہ کی ایف آئی آر بھی درج کرائی گئی مگر عالم دین کے لیے کوئی سزا واجب نہیں سمجھی گئی۔ اس لیے ایسا قانون موثر ثابت نہیں ہوا۔

ہتھیاروں سے لیس ایک گروہ نے، مریدکے میں ایک لڑکی سے زیادتی کی جسے

وہ اغوا کر کے لائے تھے۔ ساہی وال میں ایک لڑکے سے شرمناک زیادتی کر کے ایک شخص بھاگ گیا۔ فیصل آباد میں ایک چودہ برس کے لڑکے سے زیادتی کا ایسا ہولناک واقعہ ہوا کہ وہ بچہ مر گیا، بلکہ اسے مار ڈالا گیا۔

چار ہزار زنا اور بدکاری کے واقعات میں سے نصف سے زیادہ چھوٹے بچے اور بیس سال سے کم عمر کے لڑکے لڑکیاں ہیں۔

جیل میں بچے:

صرف بہاولپور کے بورسٹل جیل میں ایک ہزار آٹھ سو سے لے کر ایک ہزار نو سو کے قریب بچے ہیں ان نوعمر ملزموں کی تعداد پنجاب میں اکتوبر ۱۹۹۶ء تک ۲۵۰۳ تھی۔ جن میں سے بہت سے ملزم ایک برس سے بھی زیادہ عرصہ سے جیل میں رہ رہے تھے اور کچھ ملزم تو دو برس سے بھی زیادہ عرصہ جیل میں وقت گزار چکے تھے۔

کراچی کے ایک اسی طرح کے قید خانے میں جہاں ۱۸ لوگ رہ رہے تھے ان میں صرف ایک بارہ برس کا لڑکا تھا اور ایک ۱۶ برس کا تھا۔ باقی ۲۴ یا ۱۵ سال کی عمروں کے تھے۔ ان میں سے ایک چودہ برس کا لڑکا قتل کا ملزم تھا اور اکتوبر ۱۹۹۱ء سے جیل میں تھا اور عدالت کی ۶۱ پیشیاں بھگت چکا تھا۔ ۱۹۹۳ء کے آخر میں اسی عمر کا دوسرا لڑکا جس پر بغیر لائسنس اسلحہ رکھنے کا الزام تھا، ستمبر ۱۹۹۲ء سے جیل کاٹ رہا تھا اور ۳۸ بار عدالت میں پیش ہو چکا تھا۔

کراچی کی ایک جیل میں مجرم بچوں کی تعداد ۲۲ تھی جن میں سے ایک بچے کو عمر قید کی سزا ملی تھی۔ باقیوں میں سے کچھ بچوں کو جرمانے اور کچھ کو قید کی سزا ملی تھی جو کہ ایک ماہ سے لے کر پانچ برس تک تھی۔

دوسری قسم کے قیدی بچے وہ تھے جن کی مائیں سزا کاٹ رہی تھیں اور وہ جیل میں اپنی ماؤں کے ساتھ رہ رہے تھے کیونکہ اپنے حالات کی بنا پر وہ اپنی ماؤں سے علیحدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ کراچی جیل کے صرف ایک وارڈ میں ایسے بچوں کی تعداد ۱۹۹۳ء میں ۲۱ تھی۔ یہ بچے تین مہینے کی عمر سے لے کر گیارہ برس کی عمر تک کے تھے۔

لاوارث بچے:

یہ وہ بچے تھے جن کے ماں باپ طلاق یا علیحدگی کے چکروں میں پیشیاں بھگت رہے تھے۔ ان بچوں کو نہ تو ماں کی حفاظت دستیاب تھی اور نہ ہی باپ کی حفاظت کیونکہ ان کے ابھی مقدمے چل رہے تھے اور فیصلے کا انتظار تھا۔ بچوں سے ملاقات عدالت میں کرائی جاتی تھی جہاں ماں باپ کے علاوہ عزیز و اقارب بھی آ جاتے تھے اور ایک شور و غل سا برپا ہو جاتا تھا۔ بچے روتے چیختے تھے اور جج صاحبان غصے اور خفگی کا شکار نظر آتے۔

(HRCP رپورٹ ۱۹۹۳ء صفحہ ٦٧)

بچوں سے جبری مشقت:

جبری مشقت کرنے والے بچوں کی تعداد ایک کروڑ پندرہ لاکھ تک ہے جن سے قریباً دس لاکھ بچے تو صرف قالین بانی کا کام کرتے ہیں۔ قریباً بیس لاکھ بچے اینٹیں بنانے کے کام پر مامور ہیں۔ باقی بچوں کی کثیر آبادی کاشتکاری، روڑی کوٹنا، کان کنی اور عمارتیں بنانے کے مختلف کاموں میں مصروف ہے۔ یہ کام تھکا دینے والے اور مضرصحت ہوتے ہیں۔ یہاں اوقات کار بہت زیادہ اور اجرت بہت کم ہوتی ہے۔ روزانہ مزدوری مختلف کاموں میں تین روپے سے لے کر تیس روپے یا کچھ ہی زیادہ ہوتی ہے۔ ایک بچہ جو سیالکوٹ میں فٹ بال سینے کے کام پر مامور ہوتا ہے وہ بیس روپے روزانہ پاتا ہے جبکہ وہی فٹ بال لندن میں پچاس پونڈ میں بیچا جاتا ہے۔ بالغ مزدور کام کرے تو کم از کم سو روپے روزانہ اجرت حاصل کرے گا۔

تشدد کا اجتماعی پہلو اور اس کے تین روپ

خاندان سے نکل کر جب ہم معاشرے کے بڑے اداروں میں داخل ہوتے ہیں، مثلاً برادری، قبیلہ، نسل، قوم اور وطن، تو ہمارے گردوپیش کے تمام حالات اور تمام عوامل ہر طرف سے ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہم ذہنی، جذباتی اور اخلاقی سطح پر اجتماعی زندگی میں داخل ہوکر نہ صرف اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے شناسا ہوتے ہیں بلکہ ہمیں اپنے حقوق، اپنے مطالبات اور اپنی خواہشوں اور تمناؤں کا بھی سوچ سمجھ کر کسی حد تک محاسبہ کرنا پڑتا ہے۔ یعنی ہم معاشرے سے کیا توقع رکھتے ہیں اور معاشرہ ہم سے کون سی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہے۔

یہی وہ دہلیز ہے جس پر پہنچ کر فرد اور معاشرہ ایک طرف تحمل، صبر، قوت برداشت اور ایک دوسرے کے ساتھ سلوک کرنا سیکھتے ہیں اور دوسری طرف دونوں جانب سے بعض اوقات بے صبری، غصہ، ناراضگی اور تشدد کا اظہار ہوتا ہے۔ کبھی فرد ناراض ہوتا ہے اور کبھی معاشرہ ناپسندیدگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس صورت میں باہمی تشویش اور اضطراب پیدا ہوتا ہے اور تشدد کی مختلف صورتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ افراد اور اجتماعی ادارے یا مختلف گروہ یا سماجی جتھہ بندیاں اور طبقات جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ سارا معاشرہ یا سوسائٹی مجموعی طور پر ان کے حقوق کی پابندی نہیں کر سکتے تو وہ حقوق کے حصول کے لیے "تشدد" کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ تعصب، بغض، کینہ اور غیض وغصب کے جذبات افراد اور طبقات کو مشتعل کر کے تشدد کی طرف مائل کرتے ہیں۔

تحمل کے فقدان اور غیض وغضب کی فراوانی کی وجہ سے ابھی تک انسانی معاشرے میں اور اس کرہ ارض پر تشدد کا استعمال زوروں پر ہے۔ ہر قسم کا تشدد فروغ پا رہا

ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ تہذیبی رشتے اور ان سے منسلک اخلاقی اور سماجی اقدار چاہے وہ مغرب کی ہوں یا مشرق کی، شمال کی ہوں یا جنوب کی، پامال ہو رہی ہیں۔ دنیا بھر کا میڈیا ایک طرف امن اور سلامتی کے گیت گا رہا ہے تو دوسری طرف ہر جگہ تشدد کا مظاہرہ کسی نہ کسی طور سے ضرور ہو رہا ہے۔ سیاسی، سماجی، لسانی اور نسلی سطحوں پر کرہ ارض میں ہر سو تشدد زوروں پر ہے۔

مشہور وجودی فلسفہ دان ژاں پال سارتر نے ایک دفعہ کہا تھا ''جہنم کا مطلب ہے غیر لوگ!'' یعنی جو ہم میں سے نہیں وہ ہمارے لیے ''جہنم'' ہیں۔ ان سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہی حال جدید انسانی معاشرے کا ہے۔ اس ''لاحاصلی'' اور ''بے معنویت'' کے دور میں ہم ایک دوسرے سے جغرافیائی سطح پر بہت قریب آ گئے ہیں۔ عالمگیر دیہات یا ''گاؤں'' تو یہ کرہ ارض بن گیا ہے۔ لیکن ہمسایوں سے نفرت ہر جگہ، ہر گلی میں زیادہ ہوگئی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر پا رہے۔ ہم مذہب کے نام پر زبان کے لیے، نسل کے تحفظ کی خاطر اور اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر سمت میں تشدد کے وسائل استعمال کر رہے ہیں۔ ہم نزدیک آ جانے کے باوجود جذباتی سطح پر ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ مذہبی منافرت بڑھ رہی ہے کم نہیں ہو رہی۔ نسلی اور علاقائی عصبیت میں شدت آ رہی ہے۔ مسلمان، مسلمان سے لڑ رہا ہے۔ ہندو ہندو سے نبرد آزما ہے۔ (جنوبی ہندوستان کو دیکھ لیں) بدھ مت، بدھ مت کا گلا کاٹ رہا ہے۔ سری لنکا، برما، تھائی لینڈ اور لاؤس کو دیکھ لیں۔

اس لیے اس مطالعے میں یہ ضروری ہے کہ معاشرتی اور گروہی تشدد کے مختلف پہلوؤں کا نہ صرف تجزیہ کیا جائے بلکہ ان عوامل کو بھی تلاش کیا جائے جو اجتماعی تشدد کی افزائش میں آج کل نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ اجتماعی تشدد کے تین اہم پہلو ہیں:

(i) نسلی اور لسانی۔ جو عموماً نسلی تشدد کا باعث ہوتا ہے
(ii) مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصب اور نفرت جو مذہبی تشدد کو فروغ دیتا ہے
(iii) سیاسی اغراض و مقاصد جو قوموں اور طبقوں کو سیاسی سطح پر تشدد کے استعمال کے لیے مجبور کرتے ہیں تاکہ وہ یہ مقاصد ہر قسم کے تشدد کو بروئے کار لا کر حاصل کر سکیں۔ اس تشدد کے کئی اور پہلو بھی ہو سکتے ہیں۔ ہم اقتصادی پہلو سے بھی تشدد

برپا کر سکتے ہیں۔ اقتصادی پابندیاں لگا کر۔ ہم نفسیاتی جنگ کا بھی آغاز کر سکتے ہیں اور اس طرح جنگ کے لیے باقاعدہ ہتھیار بھی اٹھا سکتے ہیں۔ گوریلا جنگ کا کھیل بھی کھیلا جا سکتا ہے۔ منظم دہشت گردی بھی کی جا سکتی ہے۔ تشدد کے ان تین پہلوؤں کے لیے یعنی نسلی، مذہبی اور سیاسی اغراض و مقاصد حاصل کرنے کے لیے تشدد کے تمام وسائل کو استعمال کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا ہے۔ آپ دنیا پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیں۔ آپ کو ہر خطے میں، ہر براعظم پر تشدد کے یہ تین روپ نظر آئیں گے۔ چلیے آپ دوسرے ملکوں اور خطوں کو نظر انداز بھی کر دیں اپنی سرزمین کا ہی جائزہ لیں۔ ۱۹۴۷ء کے آس پاس برصغیر پاک و ہند میں کیا لاکھوں انسان ہندوستان اور پاکستان کی سرزمین پر تہہ تیغ نہیں کیے گئے اور پھر پچھلی نصف صدی میں جو کچھ نائجیریا، کانگو، زائر، تنزانیہ، صومالیہ، برونڈی، یوگنڈا، چاڈ، سوڈان اور ایتھوپیا میں ہو گیا وہ افریقہ جیسے غریب اور ناتواں براعظم کے لیے کافی نہیں۔ ایشیا پر ایک نظر کریں ملیشیا میں چینیوں کا قتل عام۔ انڈونیشیا میں مسلمانوں کا اور آئرلینڈ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا۔ وسط ایشیا میں ایران، عراق، فلسطین، شام اور لبنان کے علاقوں میں اس وقت تک ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔

ہیرلڈ آر آئزیک (Harold R Isaac) نے اپنی کتاب ''Idols of the Tribe'' میں ایک تخمینہ پیش کیا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۷ء تک تمام دنیا میں ۳۴ بڑے قتل عام ہو چکے تھے جن کی وجہ سے چوہتر لاکھ اور اسی ہزار انسان نسلی، مذہبی اور سیاسی عصبیت کی بنا پر مارے جا چکے تھے۔ جن میں ۲۰ لاکھ تو صرف برصغیر پاک و ہند میں تقسیم ملک کے وقت مارے گئے تھے۔ ۵ لاکھ سوڈان میں۔ دو لاکھ روانڈا میں۔ ڈیڑھ لاکھ عراق میں اس کے بعد بوسنیا میں لاکھوں انسان کا قتل ہمارے سامنے ہے۔

اس لیے اس مختصر باب کے آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید دور میں بھی قدیم اور قرون وسطیٰ کے زمانوں کی طرح اپنے مقاصد اجتماعی تشدد کی شکل میں حاصل کیے جا رہے ہیں۔

(انکی وجوہات چاہے نسلی ہوں یا مذہبی ہوں یا سماجی یا سیاسی) وہ مقاصد یہ ہیں:

(۱) تشدد اور دہشت کے بل بوتے پر کسی ملک میں امن و امان کی فضا تباہ کر کے اپنے مقاصد کے حصول اور کامیابی کے لیے راہ ہموار کی جائے۔ اس طرح کوئی دوسرا ملک بھی خارجی سطح پر تشدد کو بروئے کار لا کر آپ کے ملک میں تشدد اور دہشت کی فضا پیدا کر سکتا ہے۔

(۲) قومی یا ملکی سطح پر اندرون ملک کوئی گروہ یا طبقہ منظّم تشدد کے منصوبے بنا کر اپنی شکایات یا محرومیوں کا ازالہ کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ اس جدوجہد میں چھوٹے مقاصد بھی ہو سکتے ہیں اور بتدریج ایک انقلاب بھی برپا کیا جا سکتا ہے۔ بڑے انقلابوں کا پیش خیمہ اکثر چھوٹے چھوٹے تشدد کے واقعات ہی ہوتے ہیں۔

(۳) بین الاقوامی سطح پر ''تشدد'' کے کسی زوردار واقعے یا حادثے کی صورت میں کوئی گروہ یا تنظیم یک دم شہرت حاصل کر سکتی ہے۔ مثلاً دہشت گردی کا ایک بڑا واقعہ۔ یا کسی بڑی شخصیت کا اغوا یا سیاسی قتل یا کسی دارالحکومت میں بڑی عمارت میں زبردست دھماکہ۔

(۴) بعض اوقات کسی ملک کے سیاسی اور ریاستی ادارے اپنی مختلف تنظیموں کے توسط سے ''قانون اور امن عامہ'' کو اپنے مفادات کے لیے مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے خود ہی ایسے کام کرتے ہیں جس سے بظاہر دہشت اور خطرے کی فضا پیدا ہو جاتی ہے، تاکہ عوام خوف زدہ ہو کر اور کسی حد تک دبک کر حاکموں کے مطیع اور فرماں بردار بن جائیں۔ کسی کو چون و چرا کرنے کی جرأت نہ ہو سکے! اجتماعی تشدد کے یہ تین روپ ہیں۔ یعنی نسلی، مذہبی اور سیاسی۔ ان کا تذکرہ ہم کسی حد تک عالمی سطح پر اس اجمال سے کریں گے کہ عالمی تاریخ کے حوالے اور تناظر میں ہم موجودہ معروضی صورت حال کو نہ صرف سمجھ سکیں بلکہ اپنے تجزیئے کے طفیل کسی حد تک مستقبل کے بارے میں کوئی معقول قیاس آرائی بھی کر سکیں۔

تشدد کا عالمی پس منظر

قوموں کے عروج و زوال کی کہانی عالمگیر سطح پر اس کے سوا اور کیا ہے کہ تہذیبی اور تمدنی اقدار کی بتدریج نشوونما اور پرورش کے دوران جب کسی قوم یا نسل نے تشدد کے بل بوتے پر کسی دوسری قوم یا نسل یا مذہبی گروہ سے زبردستی اقتدار یا مال و دولت چھیننے یا علاقہ ہتھیانے کا سلسلہ شروع کیا تو وہ پھر رفتہ رفتہ عروج کی سیڑھیوں پر چڑھتے چڑھتے خود ہی زوال کی وادیوں کی طرف جا نکلی۔ وہ قوم یا تہذیب، قدیم یونانی تھی یا لاطینی، عجمی تھی یا عربی یا تورانی۔ چینی تھی کہ ترکمانی یا جاپانی۔ جب ان قوموں اور تمدنوں کا ہم جائزہ لیتے ہیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ کس کس طرح قوموں کو شیرازہ بندی زبان نسل اور مذہب کے باہمی روابط اور رشتوں سے ہوئی۔ کس طرح لوگ بتدریج زبان، نسل، مذہب اور جغرافیائی یک رنگی کی وجہ سے اکٹھے ہوئے اور اپنی زندگیوں اور ان سے وابستہ وسائل کو ایک نسل اور ایک قوم یا ایک مذہب کے طفیل ایک ریاستی طاقت میں تبدیل کر لیا۔ پھر وہ اس نو زائدہ طاقت اور توانائی سے دوسری قوموں اور علاقوں کی تسخیر کرتے چلے گئے اور اپنی حدود سے باہر نکل کر وسیع پیمانے پر لشکر کشی اور فتوحات کا سلسلہ جاری کیا۔ تجارت کو فروغ دیا۔ اپنی تہذیب اور تمدن کو دیدہ زیب بنا کر دوسروں میں رائج کیا۔ لیکن پھر انہی نسلی، لسانی اور مذہبی اقدار کی شکست و ریخت کے نتائج سے اپنی شیرازہ بندی کو اپنے ہاتھوں خود منتشر کر دیا۔ خود زوال پذیر ہوتے چلے گئے۔ خانہ جنگیوں کا شکار ہو گئے۔ وہی تنگ نظری اور تشدد کی قوت جس نے انہیں جمع کیا تھا اور قوت بخشی تھی ان کے نفاق کا باعث بن گئی۔ وہی ''قومی تشخص'' جو اس قوم نے بہت سی قربانیوں کے بعد حاصل کیا تھا ان کے درمیان نزاع، افتراق اور جھگڑوں کا باعث بن جاتا ہے اور قوم کے حصے بخرے ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

اشتراکی فلسفہ دانوں، کارل مارکس اور اینگلز نے جدلیاتی فلسفے کے بنیادی اصول بیان کرتے ہوئے یہ دعویٰ اور پیش گوئی کی تھی کہ انسانی معاشی اور معاشرتی زندگی اجتماعی صورت میں اب اس دور میں داخل ہوگئی ہے کہ اشتراکیت کے فروغ پانے کے بعد یہ طبقاتی کشمکش جو رنگ ونسل اور زبان و مذہب کے نتائج سے پیدا ہوئی ہے، بالکل معدوم ہو جائے گی۔ یہ امتیازات ختم ہو جائیں گے اور اس قسم کی طبقاتی درجہ بندی اور قوموں کی شناخت باقی نہیں رہے گی۔ اشتراکیت کے اصولوں کے مطابق اس کا ایک وسیع تجربہ اشتراکی روس کی عظیم مملکت میں خاصی شد و مد سے کیا بھی گیا اور یوں لگا کہ نسل، زبان اور مذہب کے امتیازات اب طبقاتی کشمکش کے رنگ میں دوبارہ نہیں ابھریں گے اور شاید مستقبل میں رنگ ونسل اور مذہب کی بنیادوں پر قوموں کا بننا اور بگڑنا ختم ہو جائیگا لیکن عجیب ستم ظریفی ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے سنگم پر جس جدلیاتی فلسفہ نے فروغ پایا وہ ہمارے سامنے ہی زوال پذیر ہوگیا۔ اس کی بنیاد پر دنیا کے تقریباً نصف حصے پر اشتراکی اور جدلیاتی فلسفے کا غلبہ بھی ہوا۔ اس کے اصولوں پر مشرقی یورپ اور ایشیا کے وسیع علاقوں میں نئی ریاست سازی بھی ہوئی لیکن ساٹھ ستر سال کے اندر اندر لسانی، نسلی اور مذہبی کشمکش نے پھر زور پکڑا اور اقتصادی جڑوں کو سکھا کے رکھ دیا۔ جدلیاتی فلسفے کے اصول بھی نسلی، لسانی اور مذہبی امتیازات کو ختم نہ کر سکے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ انسانی رشتے اور سرشتے دبائے دبتے نہیں اور چھپائے چھپتے نہیں۔ بلکہ جتنا ان کو دبایا اور چھپایا جائے اتنے ہی زور سے ابھر کر اقتصادی اور معاشرتی قدروں کو پامال کرتے ہوئے اپنا سر اٹھاتے ہیں۔ دیکھ لیجئے وہی کروشیائی، بوسنیائی اور سربیائی زبانیں اور نسلیں ہیں، وہی سلاوک اور پولش لسانی تفریق۔ وہی تاتار، ترک اور تاجک معاشرے۔ وہی آذر بائجانی، چیچنیائی اور کردی قبائل اور قومیں جب رنگ ونسل کی طرف رجوع کرتی ہیں تو بعض اوقات مذہبی زنجیروں کو بھی توڑ دیتی ہیں۔ بے شک سرب اور کروٹ کے یک مذہب ہیں۔ بیشک کرد اور عراقی، کرد اور ترک ہم مذہب ہیں لیکن قومی تشخص الگ الگ ابھر رہا ہے۔ اب افغانستان میں کیا ہو رہا ہے مذہبی بنیاد پرستی کا دوبارہ ابھرنا اور اس جدید دور میں شدت اختیار کرنا ہمیں یاد دلاتا ہے کہ مسلمانوں نے ہی اپنے عروج کے زمانوں میں اس سے کام نہیں لیا، صرف عباسی اور امیہ سلطنتوں اور خلافتوں میں

ہی اس کا زور نہیں رہا بلکہ اس سے کہیں پہلے اور پھر کہیں بعد میں عیسائیت کے وسیع و عریض عہد عروج میں بھی تمام یورپ اور ایشیا کے بعض حصوں میں عیسائیت کی وجہ سے تشدد کی بدترین مثالیں انسانی تہذیب میں ابھر کر آئیں۔

آپ عیسوی رومن تشدد (The Roman Inquisition) کا زمانہ پندرہویں صدی عیسوی قرار دیں گے لیکن جو کچھ یہودیوں نے رومیوں کو اکسا کر ابتدائی عیسائی معاشرے پر حضرت عیسیٰ سے لے کر اگلے تین سو سال تک قیامتیں ڈھائیں وہ تو رومن سلطنت کے عروج میں ہوا۔

پھر اس کے بدلے عیسائیوں نے چوتھی صدی سے لے کر اگلے بارہ سو سال متواتر کسی نہ کسی شکل میں یہودیوں پر مظالم ڈھائے اور اس کے بعد کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں نے آپس میں جو تشدد کا کھیل کھیلا اس کو کس کھاتے میں ڈالیں گے۔ پھر اسلام اور عیسائیت کی لڑائیوں اور تشدد کے واقعات کا ایک وسیع دور ہے جو یورپ اور سپین سے لے کر مشرق وسطیٰ تک جا بجا پھیلا ہوا ہے۔

قرون وسطیٰ میں سپین کی سرزمین پر عیسائیت اور اسلام کے نام پر جو خون کی ہولیاں کھیلی گئیں کیا ان کا اعادہ دوبارہ ہمارے زمانے میں تو نہیں ہو رہا۔ کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کے لیے پھر پر تول تو نہیں رہی۔

ہندوستان میں کٹر مذہبی قوتوں کا ابھرنا بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے یوں لگتا ہے کہ اب کالی دیوی اور شو دیوتا کے کالے پرستار اپنے جنگلوں سے نکل کر گورے پنڈتوں اور براہمنوں سے برسر پیکار ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف ہندومت کے متشدد فرقے پھر مسلمانوں کو ملک سے باہر نکالنے یا انہیں سیاسی غلام بنانے کے درپے ہیں۔

بدھ مت ہندوستان سے ہجرت کر کے جنوبی اور مشرقی ایشیا کے وسیع علاقوں میں پھیلا تھا۔ ہندوستان میں سکندر اعظم کے آنے سے بھی پہلے بدھ مت اور ہندومت کے پرستار راجوں اور مہاراجوں میں عظیم جنگوں کی داستانیں ملتی ہیں۔ بدھ مت کے امن و آشتی کے اصول کہاں تک کارگر ثابت ہوئے؟ جنوبی اور مشرقی ایشیا میں بدھ مت کے ماننے والی اقوام ایک دوسرے سے اور دوسرے مذاہب سے تشدد کا جو سلوک کر رہی ہیں وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ وہ سری لنکا ہو یا برما، لاؤس ہو کہ تھائی لینڈ، کوریا ہو کہ فلپائن کے جزائر، ہر

جگہ مذہبی تشدد کا بھوت لوگوں پر سوار ہو رہا ہے۔

بے شک یہ تمام مذاہب اپنی ابتدائی شکل میں انسانی معاشرے میں محبت، امن، آشتی اور صبر و تحمل کا سبق دیتے ہیں۔ مثلاً عیسائیت نے ابتدا میں Stioc یعنی رواقی نظریات کے تحت روم کے آس پاس اور مشرق وسطیٰ میں مقبولیت حاصل کی۔ کہا یہی گیا کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے اور تمام انسان برابر اور معزز ہیں، چاہے غریب ہوں یا امیر ہوں ان کی نیکی پارسائی اور ہمدردی ان کو دوسروں سے ممیّز کرتی ہے۔ یہی تعلیم اسلام نے بھی دی۔ یہی تعلیم شروع میں بدھ مت اور کنفیوشس کی بھی ہے اور ویدک مذہب میں بھی اس کے بنیادی نکات ملتے ہیں لیکن مذہب جب فروغ پا جاتا ہے تو پھر دوسرے مقاصد مذہب کے نام پر مسلط کر دیئے جاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے اندر اور باہر نفرت، تعصب اور تنگ نظری کے تحت تشدد کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ جبر کے ساتھ سیاسی غلبے حاصل کیے جاتے ہیں۔ مذہب کو سیاست میں اور سیاست کو مذہب میں استعمال کرنے کے حربے اور وسیلے بہت پرانے ہیں۔ ان کے طفیل عالمگیر سطح پر بار بار جو خون کی ندیاں بہتی رہی ہیں ان کے دہانے ابھی خشک نہیں ہوئے۔ اس سے اب بھی خون کے چشمے پھوٹ سکتے ہیں اور پھوٹ رہے ہیں۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ یہ خون کی ندیاں پھر بہنے لگی ہیں۔ یہ مسئلہ اب بھی بہت اہم ہے اور اس پہ حرف آخر ابھی لکھا نہیں گیا۔ تاریخ کو ابھی اپنا فیصلہ دینا ہے۔

بہرحال یہاں تو بحث قوموں کے عروج و زوال اور تشدد کے مد و جذر کی ہو رہی تھی۔ قوموں کی عمل داری اور غلامانہ دوروں کا آغاز و اختتام ایک نہ ختم ہونے والی لمبی داستان ہے۔ آپ کسی براعظم کو کسی دوسرے براعظم پر ازلی و ادبی برتری کا دعوے دار قرار نہیں دے سکتے۔ جیسے زمینی سطح پر جغرافیائی عمل میں براعظموں کی بڑی بڑی پلیٹیں (Plates) ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں اور ایک دوسرے کو دھکیلتی رہتی ہیں، تاریخ میں بھی یہ عمل جاری رہتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر آپ ۱۴۸۰ء تک کے عالمی نقشے پر نظر ڈالیں تو شاید وہ قرون وسطیٰ کا زمانہ ہی قرار دیا جائے گا۔ یہاں اس دور میں یورپ کا تمام خطہ آپ کو کتنا چھوٹا، مدھم اور گم نام و بے نام سا نظر آئے گا۔ جس میں مغربی تہذیب کا فروغ ابھی ہلکے ہلکے نقوش میں ابھرتا نظر آتا ہے۔ یورپی تہذیب صرف آپ کو فرانس، انگلینڈ، جرمنی، ہالینڈ،

اٹلی، بوہیمیا اور سپین کے حصہ تک ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔ سپین جہاں موروں کا اقتدار اسلامی حکومت کی شکل میں خاتمے پر تھا، اس وقت پورا روس اور اس کے آس پاس کا تمام یورپی علاقہ بالکل غیر متمدن قوموں سے آباد تھا۔ جنوب مشرقی یورپ تمام کا تمام ترکوں کے قبضے میں تھا۔ سکاٹ لینڈ، آئرلینڈ اور تمام سکینڈے نیویا کے ممالک اور علاقے اور پھر پولینڈ اور فن لینڈ تمام نیم وحشی قوموں اور علاقوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان پر مغربی تہذیب کے اثرات کا ابھی نام ونشان بھی نہیں تھا۔

جدید یورپ کی ابتدا سے پہلے تقریباً ایک ہزار سال تک تمام یورپ اور اس کے تمام چھوٹے بڑے ممالک ایشیا کے مقابلے میں نہایت غیر محفوظ اور کمزور سمجھے جاتے تھے۔ یورپ کی تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ یورپ پر ایسے شدید دور تین دفعہ آئے جہاں یورپ سنگین طور پر ایشیائی فاتحوں کے پاؤں تلے بری طرح روندا گیا۔ سب سے پہلے ہن قبائل نے پانچویں صدی عیسوی میں یلغار کر کے فرانس تک علاقوں کو فتح کیا اور ان علاقوں رومی سلطنت کو تقریباً مسمار کر کے رکھدیا۔ فرانس کا علاقہ کولون تک قبضے میں کر لیا۔ پھر پانچویں صدی کی چند دہائیوں کے بعد مسلمانوں نے اپنی عظیم یلغار سے مشرقی یورپ کی رومن سلطنت کو شکست دی۔ اسے افریقہ میں شکست دی، سپین فتح کیا۔ فرانس پر حملہ آور ہوئے اور اس طرح فلسطین اور مشرق وسطیٰ سے یورپی اور رومی حکمرانوں کو مار بھگایا اور پھر تیسری بار ایک بڑی عظیم یورش اور فوجی طوفان منگولوں نے برپا کیا۔ جو آندھی کی طرح شمالی چین کے علاقوں سے اٹھا اور چین اور ہندوستان کو فتح کرتا ہوا تمام وسط ایشیا پر چھا گیا۔ بغداد کو تہس نہس کیا، روس کو لتاڑا اور دو صدیوں تک روس کو ہوش میں نہیں آنے دیا۔ انہی منگول پادشاہوں نے مشرقی رومی سلطنت کا نام ونشان مٹا دیا اور سترہویں صدی عیسوی تک جرمنی تک علاقوں کو اپنی زد میں رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم تمدن کے تمام مراکز چاہے وہ یورپ میں تھے کہ ایشیا میں وہ دہلی تھا کہ بغداد، روم تھا کہ کوئی اور شہر یا ملک سب منگولوں کے ہاتھوں مسمار ہو گئے۔ اس وقت کی مضبوط ترین مملکتوں کو سرنگوں کرنے کا سہرا منگولوں کے سر پر ہی باندھا جا سکتا ہے، جو خود تقریباً وحشی اور نیم مہذب معاشروں میں ہی شمار کیے جاتے تھے لیکن جنگ اور تشدد کے جو معرکے انہوں نے مارے وہ کام یورپ اور ایشیا کے کسی سکندر یا دارا سے نہیں ہوا اور نہ نپولین نے یہ کام سرانجام دیا اور نہ ہی اس دور میں ہٹلر، مسولینی یا

سٹالن یا کوئی اور اب تک کر سکا۔ درحقیقت یورپ نے سوائے سکندر اعظم کے کوئی فاتح ایسا پیدا نہیں کیا جو فوجی تشدد کے طفیل ایشیا پر کسی حد تک اپنی حکمرانی قائم کر سکا۔ ہاں جب جدید سائنس کی ابتدا ہوئی تو یورپ نے اقتصادی ترقی اور تجارت کی وسعت کے طفیل ایشیا پر اپنی برتری ثابت کی اور اپنے اقتدار کو مختلف طریقوں سے مسلط کیا۔ یہ جدید ٹیکنالوجی کی یلغار تھی جو یورپ سے ابھر کر ایشیا پر مسلط ہو گئی۔ یہ پندرھویں صدی کا آخر تھا جب یورپ کی بحری طاقتوں نے ایک طرف تو امریکہ دریافت کیا اور دوسری طرف واسکوڈی گاما نے ''راس امید'' سے گزر کر ہندوستان کا سمندری راستہ معلوم کیا۔ ان دو واقعات کے دوران ہی مسلمانوں کی سلطنت کمزور ہونا شروع ہوئی۔ یہی وہ وقت تھا جو مسلمان حکومتوں کے گرد گھیرا تنگ ہونے لگا تھا۔ یہی وہ زمانہ بھی تھا جب مسلمان حکمران ایک دوسرے کے ساتھ نہ صرف تشدد کا سلوک کر رہے تھے بلکہ مذہبی اور قومی رشتوں کو بالائے طاق رکھ کر آپس میں جھگڑ رہے تھے، حتیٰ کہ اس بربادی کے لیے غیروں کے سامنے ہاتھ بھی پھیلا رہے تھے۔ ایک دوسرے کے خلاف یورپی حکمرانوں سے فوج اور اسلحہ کی مدد مانگ رہے تھے۔ اسی دور میں مسلمانوں کو سپین سے نکال باہر کیا گیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب یورپ سمندر کے راستوں سے ہوتا ہوا فلپائن تک پہنچ گیا پھر وہاں بھی مسلمانوں کی بیخ کنی کا دور شروع ہوا۔ یہی وہ وقت تھا جب سفید چمڑی پیلی اور بھوری رنگتوں اور نسلوں پر ہر رنگ میں غالب آنے لگی۔ اگر معین تاریخی دور کی تلاش ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۵۲۰ء سے لے کر ۱۶۰۱ء تک مغربی اقوام نے عموماً اور انگریزوں نے خصوصاً اپنے نوآبادیاتی نظام کو سمندری راستوں سے وسعت کر دی اور اپنی دولت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ ۱۸۵۸ء میں ہندوستان میں باقاعدہ انگریزی سلطنت قائم ہوئی۔ اس دور میں یورپ نے عموماً اور انگریزوں نے خصوصاً اپنی دولت اور تجارت میں کئی سو گناہ اضافہ کیا بلکہ یورپ کی آبادی میں بھی حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ ۱۸۰۱ء میں یورپ کی آبادی ۱۵۰ ملین تھی۔ ۱۹۱۴ء یعنی ایک صدی میں یہ تیزی کے ساتھ بڑھ کر ۴۵۰ ملین ہو گئی۔ اس آبادی میں وہ گورے انسان شامل نہیں رہے تھے جو اس دور میں امریکہ اور دوسری نوآبادیوں، یعنی کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور افریقہ میں آباد ہو رہے تھے یا ہو چکے تھے۔ وہ لوگ ۱۱۰ ملین کے قریب تھے۔ اگر آپ اس آبادی کو بھی شامل کر لیں تو آپ اندازہ لگائیں کہ ایک صدی میں یورپ کی آبادی ۱۵۰ ملین سے بڑھ کر ۵۶۰ ملین ہو گئی۔

تقریباً چار گناہ اضاف۔ یہ آبادی کا متشدد اضافہ یورپ کے عزائم کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی دور میں مغرب نے اقتصادی سطح پر تشدد کے اور بھی بہت سے ہتھیار استعمال کیے۔

اسی دور میں روس نے بھی اپنے ارد گرد تشدد کی انتہا کر دی۔ یورال اور شمالی ایشیا کا تمام علاقہ زور بازو سے اپنے تسلط میں شامل کر لیا۔ اندرونی اور بیرونی تشدد کے تمام اور جنوبی کا علاقہ چھوڑ کر گوری قوموں نے تقریباً ۵۳ ملین مربع میل کے علاقے پر اپنا قبضہ مکمل کر لیا تھا۔

صرف چھ ملین مربع میل کا علاقہ ایسا تھا جو برائے نام غیر مغربی اقوام کی حکومت میں شامل نہیں تھا۔ یہ چند ممالک چین، تبت، سیام، ترکی، افغانستان اور ایران تھے۔ افریقہ میں چھوٹے سے دو ملک لائبیریا اور ہیٹی برائے نام آزاد تھے۔ باقی ساری دنیا مغربی اقوام کے شکنجے میں تھی۔

بیسویں صدی میں انقلابات کا ایک اور سلسلہ شروع ہوا۔ چھوٹی اقوام نے سر اٹھانا شروع کیا اور کچھ مغرب نے بھی محسوس کیا کہ اگر ان علاقوں کو آزاد نہ کیا گیا تو جدلیاتی فلسفے کی یلغار ان کو بہا کر کہیں اور لے جائے گی۔ عین اسی وقت جب رنگ و نسل اور کسی حد تک مذہبی روایتی اقدار کو دھچکا لگنے کے امکانات پیدا ہوئے تو یورپی تہذیب کے علمبرداروں نے کئی ایسی چالیں چلیں جن سے رنگ و نسل اور مذہب دوبارہ عالمی سیاست میں اپنا زور دکھانے لگے۔ مغربی تہذیب کے دونوں ہتھیار یعنی نو آبادیاتی نظام حکومت اور سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کو ایک اور طرف سے شدید خطرہ لاحق ہوا اور وہ تھا اشتراکی، پرولتاری آمریت کا نظام جو ابھرا تو جدلیاتی فلسفے سے تھا لیکن روسی اثرات کے باعث اس کی شدت اظہار نے رخ کوئی اور اختیار کر لیا تھا۔ مغربی تہذیب اور تمدن نے جب اس خطرے کو محسوس کیا تو سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کو بچانے کے لیے اس نے نو آبادیاتی نظام حکومت اور مغربی سلطنت کی قربانی پیش کردی۔ یہ وہ اہم وجہ تھی جس سے بہت سے علاقے اتنی سرعت اور تیزی کے ساتھ آزاد ہو گئے۔

ادھر اشتراکی پرولتاری آمریت اپنے اندرونی خلفشار اور اقتصادی غلطیوں کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگی تو اس کے ارد گرد کی قوموں اور ملکوں میں قومی، نسلی اور لسانی شعور کو ابھار کے اشتراکی نظام کے مقابلے میں لا کھڑا کیا گیا۔ وسائل کی شکل میں ان

کے پاس تشدد کے تمام ہتھیار اور اوزار بھی موجود تھے اور رنگ و نسل اور زبان و مذہب کے اشتعال انگیز حربے بھی تھے۔ غرض ہر جگہ خواہ وہ مشرق و مغرب ہو ویت نام ہو کہ کمبوڈیا، افغانستان ہو کہ ایران، روس کے اردگرد علاقوں سمیت مشرقی یورپ، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں آزادی کی لہر کے ساتھ ساتھ تشدد کی زبردست آندھی بھی اٹھی۔ جس نے ہر قسم کے نفاق، نفرت اور تنگ نظری کو ہوا دی۔ اس نے دنیا کے امن کو خطرہ لاحق کر دیا۔ مغرب نے اپنی ''سرد جنگ'' سے نجات حاصل کر کے باقی دنیا کو تشدد کے جہنم میں دھکیل دیا۔ یہ کیسے ہوا اور کیوں ہوا؟ اس کے اسباب کا تجزیہ اتنا آسان بھی نہیں!

بہرحال اس کا جائزہ لینا پھر بھی ضروری ہے کہ آخر اس صورت حال کی کیا وجہ ہے کہ بظاہر مغربی تہذیب کے غلبہ کی صورت میں سیکولر اقدار کو فروغ ملا لیکن شمرق میں مشرقی روایات اور تہذیب و تمدن کا احیاء اس رنگ میں نہیں ہوا کہ مشرقی ثقافت کو کوئی خاص ترقی حاصل ہوئی ہو۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ مذہبی بنیاد پرستی کے وسیلے سے عالمگیر تشدد میں بہت اضافہ ہوا۔ جب ہم انفرادی اور اجتماعی تشدد کے بعض پہلوؤں پر غور کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ان دونوں معاشروں میں چاہے وہ سیکولر اقدار کے حامی ہوں یا بظاہر مذہبی اقدار کے فروغ پانے والے علاقے ہوں عورتوں اور بچوں پر تشدد کے واقعات میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ انفرادی جرائم اور بچوں پر تشدد کے واقعات میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ انفرادی جرائم اور تشدد کی شرح بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ مغربی تہذیب اور تعلیم کے عام ہونے سے خیال تھا کہ دنیا کے مہذب خطوں میں، خاص طور پر ترقی یافتہ ممالک میں انفرادی تشدد یعنی قتل و غارت، طلاق، مار پیٹ، چوری چکاری، اغوا اور لوٹ مار کے واقعات میں کمی ہو گی لیکن مادی ترقی کے باوجود مادی اشیا کی خاطر تشدد استعمالکرنے کا رجحان، گوروں اور کالوں، دونوں میں عام ہوا۔ تعلیم کی ترقی نے اس رجحان میں کوئی خاطر خواہ کمی نہیں کی۔ پس ماندہ ملکوں میں بھی انفرادی تشدد اور جرائم میں اضافہ ہوا لیکن اس کی شرح اتنی تیزی سے بلند نہیں ہوئی تاہم بحیثیت مجموعی تمام ممالک میں تشدد میں بہرحال اضافہ ہوا ہے۔ ناروے میں خودکشی کی شرح بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ افغانستان میں کمیونسٹ حکومت کے زوال کے باوجود اسلام کی خاطر جہاد کرنے والوں نے اپنے بھائی مسلمانوں کا جس طرح گلا کاٹنا شروع کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے بھی روس

اور کمیونزم کے خلاف جہاد محض سیاسی بنیادوں پر تھا۔ غلبہ حاصل کرنے کے لیے تھا۔ اقتدار کی شدید خواہش نے انہیں تشدد پر مجبور کیا تھا اور جب تک حکومت حاصل نہیں ہو جاتی افغانستان کے مذہبی گروہ آپس میں لڑتے رہیں گے۔ اغراض سیاسی ہیں یا نسلی اور لسانی، مذہب کو محض استعمال کیا جا رہا ہے۔ اسی پس منظر میں آپ مذہبی بنیاد پرستی کا احیاء بھی دیکھ سکتے ہیں۔ وہ آئرلینڈ ہو کہ سکاٹ لینڈ یا اسی طرح کوئی اور خطہ۔ ایران اور پاکستان میں مذہبی بنیاد پرستی اور مذہبی تشدد کا فروغ ایک حد تک سیاسی وجوہ کی بنا پر ہی ہے۔ مذہب کو محض جذباتی وسیلے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ شیعہ سنی فسادات کے پیچھے ایران اور سعودی عرب کے سیاسی مقاصد کارفرما نظر آتے ہیں۔ یہی حال سری لنکا اور جنوبی ہندوستان کے بعض علاقوں کا ہے۔ جن کے پیچھے ہندوستانی حکمت عملی بھی شامل ہے اور سرد جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد عالمی سیاست کی نئی بساط بھی ہے۔ نئے مہرے اور نیا کھیل ہے۔

اس صورت حال سے ایک بات تو عیاں ہے کہ لسانی اور نسلی تعصب، مذہب اور فرقہ واریت کی وجہ سے تنگ نظری اور ایک دوسرے سے نفرت میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ کرہ ارض پر نئے رنگ میں انفرادی اور اجتماعی تشدد کا ایک سیلاب امڈ آیا ہے۔ انفرادی جرائم میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ تمام خطوں میں لڑائی اور تشدد کے واقعات سیاسی رنگ بعد میں اختیار کرتے ہیں پہلے ان کا رنگ خالص مذہبی، لسانی اور نسلی ہوتا ہے۔ تشدد کی وجہ آبادی میں اضافہ بھی نہیں۔ مغربی ممالک میں آبادی کی شرح بے حد کم ہونے کے باوجود تشدد بڑھ رہا ہے۔ ایسے بھی ممالک ہیں جہاں آبادی کی شرح میں پچھلے کئی سال میں اضافہ ہوا ہی نہیں بلکہ کمی ہوئی۔ جیسے ناروے یا سویڈن وغیرہ لیکن انفرادی جرائم اور تشدد میں مسلسل اضافہ ہوا۔ شرح خواندگی ۱۰۰ فیصد ہے لیکن خودکشی کی شرح میں بھی ہر سال تقریباً ۵۰ سے ۱۰۰ فیصد اضافہ ہو رہا ہے۔

مثال کے طور پر دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں سے دو سب سے بڑے اور سب سے زیادہ طاقتور ملکوں کے تعلیمی نظام اور اس کی وسعت کا اندازہ لگائیں۔ امریکہ میں ۱۹۰۰ء میں تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں استادوں کی کل تعداد ۲۴ ہزار تھی۔ ۱۹۲۰ء میں یہ تعداد ۴۹ ہزار ہو گئی۔ اب اس صدی کے آخر میں ۲۴ ہزار سے بڑھ کر چار لاکھ ۳۸ ہزار طلبا اور طالبات تھے۔ ۱۹۵۹ء میں تعداد ۳۸ ہو گئی تھی اور ۱۹۷۰ء میں یعنی کل ستر سال میں یہ

شرح دو لاکھ سے بڑھ کر ایک کروڑ اور ساٹھ لاکھ ہو چکی تھی۔ اب یہ شرح دو کروڑ کے قریب ہے۔

اسی طرح تعلیمی آبادی میں روس میں بھی بے حد اضافہ ہوا ہے۔ پچھلے ستر سال میں روس میں یہ اضافہ ایک سو گنا سے بھی زیادہ ہوا ہے۔ کچھ سال پہلے روس میں کل آمدنی کا ۲ یا ۴ فیصد حصہ تعلیم پر خرچ ہوتا تھا اور امریکہ میں کل قومی آمدن کا ۲۸ فیصد حصہ خرچ ہوتا تھا۔ ایٹمی طاقت کے حصول کے علاوہ اخلاقی سطح پر اس نظام تعلیم کی بے پناہ وسعت نے کیا فائدہ پہنچایا اس کا حال بھی ہم سب کے سامنے ہے۔ یہی حال جرمنی، فرانس، انگلینڈ، ہالینڈ، ناروے، سویڈن، ڈنمارک اور بیلجیم کا ہے۔ انفرادی سطح پر مغربی شہری زیادہ خوش حال اور آسودہ ہے۔ مادی ترقی اسے حاصل ہے لیکن اضطراب، تشویش اور بے سکونی میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ امریکہ جو دنیا کا امیر ترین براعظم ہے صرف ۱۹۶۵ء میں یہاں پچاس لاکھ جرائم کا باقاعدہ ارتکاب ہوا جن کو رجسٹر کیا گیا ہے یہ شرح، آبادی کش شرح میں اضافے سے ۱۴ گنا زیادہ تھی۔ (مثلاً دس سال میں آبادی میں کل اضافہ ۱۳ فیصد ہوا لیکن اس کے برعکس جرائم میں اضافہ ۱۷۸ فیصد ہوا)

اس ملک میں ہر دس سیکنڈ کے بعد ایک جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ ہر پانچ منٹ کے بعد ایک قتل اور ہر پندرہ منٹ کے بعد ایک زنا بالجبر ہوتا ہے۔ پچھلے ۱۶ سال میں قتل کی شرح میں تین گناہ اضافہ ہوا ہے۔ ہر منٹ کے بعد ایک کار چوری ہوتی ہے اور پانچویں سیکنڈ کے بعد ایک چوری کی واردات ہوتی ہے۔ یہ اعداد و شمار ۱۹۶۵ء کے ہیں۔ ان تیس برسوں میں اضافہ ۱۰۰ فیصد سے زیادہ ہو چکا ہے۔ انگلینڈ میں قتل بالارادہ کی شرح میں پچھلے دس سال میں ۳۵ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ تشدد کی وارداتوں میں سکاٹ لینڈ میں ۱۰۰ فیصد اضافہ ہوا۔ مغربی جرمنی میں ۱۹۶۶ میں بھی ۲۰ لاکھ جرائم ریکارڈ کیے گئے تھے اور پھر ۱۹۷۰ء میں یہ تعداد ۲۰ لاکھ سے بڑھ کر ۲۴ لاکھ ہو گئی تھی۔ پچھلے دس سال میں فرانس میں چوری اور ڈکیتی کی وارداتوں میں ۱۷۷ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ فرانس میں ایک ریسرچ ریفرنڈم کے دوران لوگوں کی بھاری اکثریت نے برملا اظہار کیا کہ سب سے بڑی تشویش اور خوف جو فرانسیسی شہری کو محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب وہ اپنے گھر سے باہر نکلتا ہے تو کہیں وہ سر راہ کسی انفرادی تشدد کا نشانہ نہ بنا دیا جائے۔ بیلجیم میں ۱۹۷۰ سے ۱۹۷۸ء تک جرائم کی شرح

دوگنی ہو گئی ہے۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ (The Situation of the World in 1970) میں باقاعدہ اس بات کا اقرار کیا گیا تھا کہ مغرب عموماً اور امریکہ کے براعظم خصوصاً اب جرائم کے لامحدود سمندر بن گئے ہیں۔ ایک بہت ہی ترقی یافتہ اور مہذب ملک کا نام نہ لیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ۱۹۵۵ء میں دس لاکھ جرائم کا پولیس کو سامنا تھا اور ۱۹۶۵ء میں ۲۵ لاکھ مجرم ہیں جو پولیس کے بس میں نہیں۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے اس رپورٹ کے شروع میں لکھا تھا کہ حالات اب نہج پر پہنچ گئے ہیں کہ تشدد اور جرائم کی وجہ سے جدید زندگی اور تہذیب کو مغرب میں مکمل تباہی کا سامنا ہے۔ یہی حال منشیات اور اسلحہ کی سمگلنگ اور ان سے منسلک خطرناک منڈیوں اور مافیوں کا ہے۔ ان کی نقل وحرکت منظم اور خوفناک حد تک بے قابو ہو چکی ہے۔ ریاستیں اور ملک اور انکے قانون نافذ کرنے والے ادارے ان کے مقابل نہ صرف بالکل بے بس ہو چکے ہیں بلکہ کئی ممالک میں ان کے کہنے پر بنیادی اقتصادی اور سیاسی قومی فیصلے کیے جاتے ہیں۔

۱۹۷۸ء کی امریکی پبلک ہیلتھ رپورٹ میں اس کا برملا اظہار کیا گیا ہے کہ ہر پانچویں امریکی شہری باقاعدہ "نروس بریک ڈاؤن" یعنی اعصابی اختلاج کا شکار ہے۔ ان میں ۱۹ سال کی عمر سے لے کر ۷۹ سال کے بوڑھے لوگ تک شامل تھے اور یہ اعداد وشمار ایک سو گیارہ ملین لوگوں کا چیک اپ کرنے کے بعد تیار کیے گئے تھے۔

سویڈن، امریکہ کے بعد دوسرا ملک ہے جس کی خودکشی کی شرح سب سے زیادہ ہے۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO) نے ۱۹۶۸ء میں ایک فہرست شائع کی تھی کہ خودکشی کی شرح کے لحاظ سے آٹھ ملک جو دنیا بھر میں سرفہرست ہیں وہ ہیں جرمنی، آسٹریا، کینیڈا، ڈنمارک، فن لینڈ، ہنگری، سویڈن اور سوئٹزرلینڈ۔ سرطان اور دل کے دورے کے بعد ان ممالک میں خودکشی کے ذریعے سب سے زیادہ لوگ مرتے ہیں۔

جدید انسانی تشدد کو باطنی سطح پر اندر اور باہر نہ صرف قبول کر رہا ہے بلکہ اسے نجات کی راہ بھی قرار دے رہا ہے۔ یہ وہ خطرناک راستہ ہے جس پر انسانیت، خاص طور پر جدید مہذب انسانیت روانہ ہو چکی ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ یہ صرف مغربی تہذیب یا یورپ اور امریکہ کا ہی حال ہے۔ جدید تمدن کی زد میں آنے والے تمام ملک اس تقدیر سے دو چار ہیں۔ کرہ ارض

کے دوسری طرف جاپان اور کوریا میں بھی یہی ہو رہا ہے حالانکہ وہاں خاندان اور گرہستی کی روایات ابھی کافی مضبوط ہیں۔ لیکن خودکشی کی شرح اور جرائم میں خوفناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ ان کے اعداد و شمار یورپی اقوام سے کم نہیں۔ ان کے ہاں تو ''ہارا کیری'' وغیرہ کی رسمیں پہلے سے موجود تھیں۔ انسانی زندگی کو وہ مکمل انفرادی اختیار میں سمجھتے ہیں۔ جب چاہا اپنی جان لے لی!

یہی وجہ ہے کہ جدید فلسفے کے تمام مدرسہ ہائے فکر اس فکر میں گرفتار نظر آتے ہیں کہ جدید انسان اپنے اختتام کو پہنچ گیا ہے۔ پچھلے تین چار سال میں جاپان کے ۱۳ بہترین ناول نگار خودکشی کر چکے ہیں۔ مغربی تہذیب اور جدید تمدن کے اس ہیجان کے غم میں بال ویلری اور آندرے مارلو اس دنیا سے روتے رلاتے گزر گئے۔

مغربی تہذیب اور جدید تمدن نے جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے بھروسے پر زندگی کی آسائشوں میں بلاشبہ بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ یونانی تہذیب کے اثرات اور رومن تمدن کے حشمت و جلال کو جس رنگ میں مغربی تہذیب نے قبول کیا اور پھر عیسائیت کی اخلاقیات نے جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے سائے میں جن سیکولر اخلاقی قدروں کو وضع کیا ان سب کے امتزاج کے باوجود ''مادیت'' ''تجسیم'' اور اشیا کا حسی تجربہ ان کو ''ماورائیت'' اور ''تجریدیت'' اور روحانیت کے میدانوں میں نہ جانے کہاں چھوڑ گیا ہے۔ اخلاق کی ''مجرویت'' پر تو بہت زور رہا، تجارت اور سماجی سلوک کے سلسلہ میں اخلاق میں بہتری بھی پیدا ہوئی لیکن تعلیم کے فروغ نے ان کے ہاں اخلاق کی اس سطح کو بالکل نہیں چھیڑا جس سے اخلاق کا رشتہ اعلیٰ روحانی اقدار سے بھی وابستہ ہو جاتا ہے۔ زندگی کا محور جب آپ مادی اشیا اور مادی اور طبعی حسیات کو بنا لیتے ہیں تو نفسیاتی اعتبار سے آپ ایک ایسی گھٹن میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس سے ''تجرید'' کا پہلو آپکے شعور اور وجدان سے رفتہ رفتہ غائب ہو جاتا ہے۔ پھر اردگرد کی اشیا، ''چیزیں'' ''ملکیت'' اور ماحول آپ کے لیے ایک ایسا قید خانہ بن جاتا ہے کہ آپ اس سے رہائی پا نہیں سکتے۔

مغربی تہذیب اور فلسفہ مادیت سے ابھر کر ''تجریدیت'' کی طرف بلند نہیں ہو سکا۔ سقراط کو زہر پلا دیا اور ارسطو کے راستے پر سکندر گامزن ہو گیا اس لیے دنیاوی آسائشوں کی تلاش اور پھر کثرت کے باوجود انسانی زندگی اپنی جذباتی، اخلاقی اور ایک حد تک روحانی

سطح پر اطمینان اور قوت سے محروم رہی۔ اس تضاد کی وجہ سے ایک خاص خلل رونما ہوا۔ مغربی تمدن اور مغربی تہذیب کو تو ایک ہزار سال اثر انداز کیا لیکن پچھلے چھ سات سو سال میں جدید سائنس اور فلسفے کی وجہ سے جو مغربی تمدن میں فرق آیا اس کے سامنے کچھ اس طرح سے گھٹنے ٹیکے کہ سیکولر اور مجرد اخلاق کو مانتے مانتے ''تہذیب'' کے تمام پہلو نظر انداز کیے۔ انسانی رشتوں اور تعلقات کی بنا محض مادی اشیا نہیں ہوسکتیں روحانی اخلاقی سطح کا ہونا ضروری ہے۔ تمدن کا مرکز سائنس اور ٹیکنالوجی ہے۔ پتھر کے زمانے سے تمدن کا سفر جاری ہے اور اب ہم ایٹم اور کمپیوٹر کے دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہ سب تمدنی کا سفر جاری ہے اور اب ہم ایٹم اور کمپیوٹر کے دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہ سب تمدنی ترقی کے ادوار کہلائیں گے۔ تہذیب اور مہذب اقوام کی ترقی اخلاقی اور مذہبی اور ثقافتی اقدار کے حوالے سے ہوتی ہے۔ ''کاروبار'' اور ''تجارت'' کے اصول تہذیب کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ ''عیسائیت'' نے مادے کی چکا چوند دیکھ کر تمدنی معاشرے سے جو افہام و تفہیم کا راستہ نکالا اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ماورائی اصول کو بھی آپ ایک تجسیم کی صورت دیں اور ایک چیز، ایک شے، ایک چھونے اور دیکھنے والی ٹھوس حقیقت بنا دیں۔ اس لیے ہر اصول کا بت اور پیکر کسی نہ کسی صورت میں بنانا پڑا۔ اس میں ''مادیت'' کا رجحان مخفی تھا اور اسی میں ''ماورائیت'' کی اور ''تجریدئیت'' کی موت تھی۔ اسی وجہ سے انسان کی اخلاقی اور ماورائی اقدار سے بھی زیادہ طاقتور اس کے پیدا کیے ہوئے ہتھیار اور اوزار ہو گئے۔ رہنے سہنے، لڑنے مرنے کے ساز و سامان کی کچھ اس طرح آمیزش بھی ہوئی اور آویزش بھی کہ لڑائی جھگڑا، مادیت پرستی، تجارت کے فوائد، تجارت میں مادر پدر آزادی کا رجحان، نفع اندوزی میں کسی قدغن سے گریز، پیداوار میں بے پناہ افزائش پر زور۔ یہ تمام رجحانات باطنی اور ظاہری سطح پر شدید بحران، کشمکش اور اضطراب کا باعث بننے لگے۔ اب مغری تمدن سطح پر مغربی انسان میں تشدد اور بربیت کا رجحان کم نہیں ہوا بلکہ انفرادی رنگ میں ہیبت ناک اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مغربی تمدن نے مغرب کی تہذیبوں کو ذلت آمیز شکست سے دو چار کر دیا ہے۔ اب تمدن کے ہتھیار اور اوزار مغربی تہذیب کی اخلاقیات اور اقدار کا قلع قمع کر رہے ہیں۔

سب سے بڑا مسئلہ جو ہمیں اس وقت درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ قوموں سے پس ماندہ اور ترقی پذیر قومیں کیا سیکھ رہی ہیں؟ ہم مغربی تمدن ہی نہیں اپنا رہے بلکہ

ہماری لاشعوری کوشش یہ ہے کہ ہم مغربی تہذیب کو بھی اپنا لیں۔ اس کے خلاف اگر ہم کوئی مزاحمت کھڑی بھی کرنا چاہتے ہیں تو وہ مذہبی بنیاد پرستی ہے۔ جس کا شعور اور وجدان بھی ہمیں حاصل نہیں۔ ہم یہودیوں کی طرح مغرب میں رہتے ہوئے ''سخت جان'' تو ہو جائیں گے لیکن ہماری روح مردہ ہو جائے گی۔ یا پھر ''عیسائیت'' کی غلطی اپنا کر ہم اخلاقیات کو مادیت کی بھینٹ چڑھا دیں گے۔ دونوں طرح کا ''ردعمل'' مشرق کے معاشروں میں نظر آنے لگا ہے۔ مشرق کے مذاہب اسلام، ہندوازم، بدھ ازم، کنفیوشزم اس ضمن میں اور اس مسئلے سے کس طرح نبرد آزما ہوتے ہیں اس سلسلے میں تاریخ کو ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ کیا ''تعصب'' کے بغیر مذہبی اور اخلاقی اقدار ممکن ہیں؟ یہ بہت بڑا سوال ہے! بہت ہی نازک نوعیت کا مگر بہت اہم! ابھی تک جو بظاہر ہمیں ''مشرق'' میں نظر آ رہا ہے وہ تو یہی ہے کہ خواہ ہماری مرضی شامل ہو یا نہ ہو مغربی تمدن اور مغربی تہذیب ہم پر سوار ہو رہی ہے۔ ساری دنیا ایک عالمگیر گاؤں میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اس گاؤں کا واحد وڈیرا بھی ایک ہے اور وہی اس کا ''شیرف'' (Sherrif) بھی ہے اور سب سے زیادہ شریف اور مہذب انسان بھی وہی تصور کیا جاتا ہے۔ وہ اس گاؤں کا حلیہ بگاڑتا ہے یا سنوارتا ہے؟ ابھی یہ دیکھنا باقی ہے لیکن شعوری نہیں تو لاشعوری طور پر ہم سب کا ''ہیرو'' وہی ہے جو شریف بھی ہے اور ''بدمعاش'' بھی۔ مردانہ صفات کا دلکش ''مجسمہ آزادی'' ہے جو مادی اور مالی لحاظ سے سب سے زیادہ طاقتور اور مالدار ہے۔

تشدد اور جنوبی ایشیا

تشدد کا ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے جب کوئی گروہ یا تنظیم اپنے سماجی یا سیاسی مقاصد پر امن طور پر گفت وشنید کے ذریعے سے حاصل نہیں کر سکتا، یا وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا اثر ورسوخ اس حد تک معاشرے میں نہیں کہ اس بات قانون کے حوالے اور دائرے میں سنی جائے تو وہ اولین ترجیح ''تشدد'' کو ہی دیتا ہے۔ دراصل انفرادی سطح پر بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ جب ایک فرد دوسرے فرد کے مقابلے میں دلیل اور منطق کے سہارے اپنا مطالبہ نہیں منوا سکتا یا لاجواب ہو جاتا ہے تو وہ تشدد کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور معاملہ لڑائی جھگڑے یا مار پیٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ جب ''بات'' کا ''ٹکا'' نہیں چلتا وہاں ہاتھ کا ''مکا'' تو ضرور چلے گا۔ جہاں بات بے بس ہو جاتی ہے وہاں لات سے کام لیا جاتا ہے۔

اسی پس منظر میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اکثر وہ قومیں جو تمدنی اور سیاسی اعتبار سے کمزور ہوتی ہیں، جن میں تعلیم اور ترقی کا فقدان ہوتا ہے وہ طاقت اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے جبر اور تشدد کا راستہ اختیار کرنا اپنے لیے زیادہ آسان سمجھتی ہیں۔ ان کے معاشروں میں تشدد کا رجحان بہت جلد فروغ پا جاتا ہے۔''تشدد'' اور دہشت گردی ''عموماً'' کمزور عناصر کا وطیرہ ہوتے ہیں۔ طاقت ور عناصر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے فوری طور پر تشدد کا راستہ اختیار نہیں کرتے۔ وہ پہلے پرامن وسائل استعمال کرتے ہیں۔ اگر ان سے مسائل حاصل نہ ہوں تو تشدد کو بالآخر استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس کمزور گروہ اور قومیں عموماً تشدد اور دہشت گردی کو اولین وسیلے کے طور پر استعمال کرنے کا رجحان رکھتی ہیں۔

اس مشاہدے کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو جنوبی ایشیا کی صورتحال عجیب و

غریب نظر آتی ہے۔ جنوبی ایشیا کی جو موجودہ معاشی اور معاشرتی صورت حال ہے وہ خاصی پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہے۔ ان دنوں اس خطے میں مذہبی فرقہ واریت کے تشدد کے ساتھ، لسانی اور الجھی ہوئی ہے۔ ان دنوں اس خطے میں مذہبی فرقہ واریت کے تشدد کے ساتھ، لسانی اور نسلی تشدد کی تند و تیز رو چل رہی ہے۔ افغانستان سے لے کر پاکستان، ہندوستان، بھوٹان، نیپال اور بنگلہ دیش، برما اور نیچے سری لنکا تک جو کچھ ہو رہا ہے ہمارے سامنے ہے۔ وہاں سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے مذہبی، لسانی اور نسلی تشدد بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے دو سال میں مغربی تہذیب اور مغربی نو آبادیاتی نظام نے جو کچھ وراثت کی شکل میں یہاں چھوڑا وہ سب اکارت جا رہا ہے۔ فائدے، نقصان میں تبدیل ہو رہے ہیں اور اس کے ساتھ ان ممالک کی جو اپنی تہذیب اور اخلاقی اقدار اور وراثت تھی اور جو اپنے تمدنی رشتے اور وسائل تھے وہ بھی رائیگاں ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ ان ممالک کی انفرادی سطح پر وطنیت، قومی یک جہتی اور سماجی ہم آہنگی ٹوٹ پھوٹ کا شکرا ہو رہے ہیں۔ رنگ و نسل اور فرقہ واریت کے جھگڑے تشدد کی صورت اختیار کر کے باہمی تنازعوں اور جھگڑوں کی صورت میں معاشرے کی شکست و ریخت کا باعث بن رہے ہیں۔

ان ممالک نے جب انگریزوں، فرانسیسیوں اور ولندیزیوں سے آزادی حاصل کی تو ان میں سے اکثر نے سیاسی طور پر یہ انتخاب کیا کہ وہ اپنی حکومتوں اور سیاسی ڈھانچوں کو بے تعصب یعنی سیکولر بنیادوں پر تعمیر کریں گے۔ مذہب سیاسی ڈھانچے پر اثر انداز نہیں ہو گا لیکن رفتہ رفتہ اس سے انحراف ہوتا گیا۔ قائداعظم کے پاکستان سے یہ بات شروع ہوئی۔ پھر ہندوستان، سری لنکا اور اب بنگلہ دیش میں بھی یہ رجحان غالب آ رہا ہے۔ بنگلہ دیش نے اپنی لسانی اور نسلی کشمکش کے تحت پاکستان سے آزادی بزور بازو اور ہندوستان سے ساز باز کر کے حاصل کی۔ ان کے آئین میں ۱۹۷۱ء میں یہ درج کیا گیا کہ سیاست میں مذہب کا کوئی دخل نہیں ہو گا لیکن پھر مذہبی انتہا پسندوں کے اصرار پر اس شق کو آئین سے نکال دیا گیا۔ قائداعظم نے ۱۹۴۷ء میں گیارہ اگست کو آزادی سے چار دن پہلے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں معرکتہ الآرا تقریر میں واشگاف الفاظ میں کہا کہ ہم پاکستانی قوم ہیں۔ اب سیاسی سطح پر مذہبی شناخت باقی نہیں رہی۔ سیاسی اعتبار سے اب کوئی مسلمان، ہندو، سکھ یا عیسائی نہیں رہا۔ ہم سب یکساں ہم طور پر پاکستانی قوم کے شہری ہیں۔ ہمارے حقوق برابر ہیں ہم

انفرادی طور پر اپنے مذاہب کے پیروکار رہیں گے۔ لیکن قائداعظم کے اس اعلان کو جو پاکستان کا بنیادی محور تھا، یکسر بھلا دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں آئینی تعطل پیدا ہوا۔ آئین بننے میں دیر لگی اور جب آئین سازی ہوئی تو مذہبی بنیاد پرستوں نے کمزور سیاسی لیڈر شپ سے وہ غلطیاں سرزد کروائیں جن کے نتیجے میں جمہوری اقدار کی نفی ہونے لگی۔ ادھر ہندوستان کو ہندو دیش اور پاکستان کو مسلمان کا وطن قرار دے کر ہم نے انتقال آبادی کے اصول کو لاشعوری طور پر مان لیا۔ اس کے نتیجے میں تشدد اور غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ ''ہجرت'' کی روایت قائم ہوئی اور پھر پاکستان کو ہندوؤں اور سکھوں نے ہجرت کر کے ہندوؤں کے لیے ہندوستان کو پوتر بنانا شروع کیا۔ اس طرح ہم مذہبی تشدد کے دور میں داخل ہو گئے۔ سیاسی اغراض کے لیے مذہب کو جب آڑ بنایا جائے تو پھر یہ معاملہ یہاں ختم نہیں ہوتا۔ پھر لسانی اور نسلی دھڑے بندیاں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ پاکستان میں بنگالی کا مسئلہ اور پھر بنگالی حقوق کا مسئلہ بنگلہ دیش کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ ہندوستان میں ''خالصتان'' کا مسئلہ اور پاکستان میں قومی مہار موومنٹ اور سندھی اور سندھو دیش کی تحریک، سب انہی حالات کا نتیجہ ہیں۔

برصغیر ہند میں نسلی اور مذہبی تشدد کی روایت بہت پرانی ہے۔ آریاؤں نے دراوڑ قبائل پر مذہبی تشدد کر کے ان کی نسلوں کو ہندوستان کے جنگلوں میں دھکیل دیا۔ پھر بدھ مت والے جب عروج پر آئے تو ہندوؤں کے ساتھ ان کا تصادم ہوا۔ برہمن، کھشتریوں، ویش اور شودر قوموں کی ذات پات کی تقسیم سے تنگ آتی ہوئی قوموں کو جب بدھ مت کا اور پھر اسلام کا پیغام ملا تو شمالی ہندوستان کے علاقوں کے علاوہ جنوبی ہندوستان اور اسکے آس پاس کے علاقوں تک بدھ مت کو فروغ حاصل ہوا۔ جب ہندومت نے پھر عروج حاصل کر کے بدھ مت کو دیش نکالا دیا تو شمال سے اسلام کے ورود پر مقامی قوموں کو پھر سر اٹھانے کی جرأت ہوئی۔ اسلام، مسلمان حاکموں کی وجہ سے ہندوستان میں بہت کم پھیلا۔ اگر حکمرانوں کے تسلط کی وجہ سے اسلام پھیلا ہوتا تو مسلمانوں کی اکثریت، یوپی اور دہلی کے اردگرد کے علاقوں میں ضرور ہوتی، جہاں صدیوں تک مسلمان حکمران رہے۔ اسلام برصغیر کی سرحدوں پر پھیلا۔

ہندوستان کے تین بڑے مذاہب، یعنی ہندومت، بدھ مت اور اسلام کی تاریخ

محفوظ ہے۔ ان تینوں مذاہب کی اپنے اپنے دور میں آویزش بھی رہی اور روایات کی آمیزش بھی رہی۔ مذہبی اقدار جب تہذیبی اقدار کا روپ دھارتی ہیں تو علاقائی مذاہب ان اقدار پر بحیثیت مجموعی ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ مذہبی تعصب سے اگر ہم تہذیبی اقدار کو پاک نہیں کریں گے تو مذہبی تشدد ضرور گل کھلائے گا۔

پنجاب میں ہندو مسلم کشمکش کے نتیجے میں سکھ ازم کی ابتدا ہوئی۔ یہ ایک ردعمل تھا جس کے نتیجے میں بابا گرو نانک نے سکھ ازم کے کچھ ایسے اصول وضع کیے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو امن اور آشتی کا درس دینے کے لیے تھے لیکن سکھ ازم بھی جلد ہی سیاست کا شکار ہو گیا۔ ثابت ہوا کہ ہر مذہبی تحریک جلد ہی سیاست کی گرفت میں آ جاتی ہے۔ پنجاب میں سکھ ازم سے بھی مذہبی کشمکش اور فرقہ واریت کی تاریخ میں اضافہ ہوا۔ اکثر لوگوں کو اس بات کا علم نہیں کہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں سکھوں کو جب سیاسی عروج حاصل ہوا تو پنجاب میں مذہبی تشدد کی انتہا کر دی گئی۔ سکھوں نے لشکر کشی کر کے مسلمان سرداروں، جاگیرداروں اور صوبیداروں کو شکست دی جو پنجاب کے مختلف اضلاع کے حکمران تھے۔ یہ مغلیہ حکومت کے زوال کا دور تھا۔ اس افراتفری کے زمانے میں سکھوں نے اپنی شیرازہ بندی کر کے مسلمانوں پر سبقت حاصل کی۔ ان ابتر حالات میں جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تحریک رونما ہوئی تو سکھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس تحریک کی ناکامی کے بعد جب پنجاب میں انگریزوں کا تسلط قائم ہوا تو مسلمانوں کو سکھوں کے ظلم و استبداد سے نجات ملی۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے سکھوں کی لشکر کشی کے باعث وسطی پنجاب اور جالندھر سے لے کر گورداسپور، ہوشیار پور، فیروز پور، سیالکوٹ گجرات، جہلم اور راولپنڈی تک تمام علاقوں میں مسلمانوں کی حالت کافی دگرگوں ہو چکی تھی۔ انگریزی حکومت سے مسلمانوں کو پھر اس علاقے میں سکون اور اطمینان سے زندگی بسر کرنے کا موقع ملا۔ اقتصادی سطح پر ہندوؤں اور سکھوں کی بہتر حالت کے باوجود مسلمان اپنی اکثریت کے باعث پنجاب میں اپنا اثر و رسوخ دوبارہ بحال کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس میں مسلمان جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے انگریزوں کے ساتھ اچھے مراسم بھی ایک بڑی وجہ ثابت ہوئے۔

بہرحال ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی سیاسی کشمکش میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ مسلمانوں کے سیاسی شعور میں جو اضافہ ہوا اس کے باعث ہی ہندوؤں نے سیاسی سطح پر

اسے غلط رنگ بھی دینا شروع کیا۔ انہوں نے مسلم لیگ کی سیاسی تحریک کو مذہبی تنگ نظری اور فرقہ واریت کی عصبیت پر محمول کیا۔ مسلمانوں کی بعض چھوٹی مذہبی تنظیموں مثلاً مجلس احرار اور کچھ اور ایسی ہی جماعتوں کو ملا کر یہ تاثر دیا کہ قومی سطح پر مسلمان بھی نیشنل کانگریس کے ساتھ ہیں۔ اسی طرح سکھوں کو بھی مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر ہمدردی حاصل کی گئی۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی سیاسی کشمکش میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ مسلمانوں کے سیاسی شعور میں جو اضافہ ہوا اس کے باعث ہی ہندوؤں نے سیاسی سطح پر اسے غلط رنگ بھی دینا شروع کیا۔ انہوں نے مسلم لیگ کی سیاسی تحریک کو مذہبی تنگ نظری اور فرقہ واریت کی عصبیت پر محمول کیا۔ مسلمانوں کی بعض چھوٹی مذہبی تنظیموں مثلاً مجلس احرار اور کچھ ایسی ہی جماعتوں کو ملا کر یہ تاثر دیا کہ قومی سطح پر مسلمان بھی نیشنیا کانگریس کے ساتھ ہیں۔ اسی طرح سکھوں کو بھی مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر ہمدردی حاصل کی گئی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی سیاسی کشمکش میں قائداعظم کی بیدار مغزی کے طفیل ۱۹۳۵ء کے بعد ایسی مثبت تبدیلی آئی کہ اگلے دس بارہ سال میں ''پاکستان'' کا سیاسی تصور پیش کر کے مسلم لیگ نے ہندوستان کی تقسیم پر انگریزوں کو آمادہ کر لیا۔ اس میں سرسید کی تعلیمی اور سیاسی بصیرت کا بھی بڑا ہاتھ تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں مغربی طریقہ تعلیم کے متعلق ناجائز تعصب اور بغض کا خاتمہ ہوا۔ مسلمانوں نے انگریزی تعلیم حاصل کر کے ہندوؤں کے اس گمراہ کن پراپیگنڈہ کا رد پیش کیا کہ مسلمان، بحیثیت قوم، تنگ نظری اور مذہبی عصبیت کا شکار ہیں۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ مغربی مفکروں کا یہ ایک غلط تاثر یہ بھی تھا کہ مسلمان حکمرانوں کے جبر و استبداد کی وجہ سے جو علاقے مسلمان ہوئے تھے وہاں ان کے خلاف ایک مزاحمت کی فضا موجود تھی۔ موجودہ تحقیق اس نظریے کی تردید کرتی ہے۔ تمام محقق اس بات پر متفق ہیں کہ ان علاقوں میں اسلام نہیں پھیلا جن میں مسلمانوں کی حکمرانی دیر تک رہی بلکہ اسلام ان اولیا کرام اور مشائخ کی تبلیغی اور تربیتی مساعی سے پھیلا جو ان حکمرانوں کے تسلط سے دور تھے۔ مثلاً دہلی، آگرہ، لکھنؤ، احمد آباد، احمد نگرا اور بیجاپور وغیرہ میں مسلمانوں کی آبادی نے کبھی یہ صورت اختیار نہیں کی کہ ان علاقوں میں ان کی اکثریت کے آثار پیدا ہوئے ہوں۔ یہاں تک کہ ٹیپو سلطان کے علاقہ میسور میں بھی، جس کے متعلق اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ وہاں جبری طور پر لوگ مسلمان کیے گئے، مسلمانوں کی آبادی کبھی ۱۰

فیصد سے زیادہ نہیں ہوئی۔ اسکے برعکس ہندوستان کے کناروں پر واقع علاقے شمال مغرب میں پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان اور جنوب مشرق میں بنگال آسام اور کسی حد تک بہار کے علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تیزی سے بڑھی۔ اس طرح مالا بار میں بھی مسلمانوں کی آبادی زیادہ سرعت کے ساتھ بڑھی اور تقریباً ۳۰ فیصد تک ہوگئی۔ حالانکہ وہاں مسلمانوں کی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی۔ اس بنا پر مغربی دانشوروں مثلاً آرنلڈ وغیرہ نے صحیح استدلال کیا ہے کہ اگر پرتگالیوں نے مسلم مشائخ کو زبردستی تبلیغ سے نہ روکا ہوتا تو مالا بار کا سارا علاقہ مسلمان ہو گیا ہوتا۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اسلام نے ہندوستان میں ان علاقوں میں جلد نفوذ کیا جہاں ہندومت کے بعد بدھ مت کا غلبہ رہا۔ ہندومت کے ذات پات کے تعصب کے بعد جہاں جہاں بدھ مت نے فروغ پایا وہیں اسلام نے بھی مقبولیت حاصل کی۔ اسی وجہ سے شمالی ہندوستان کے علاقوں میں اسلام اور بدھ مت کو کامیابیاں حاصل ہوئیں۔

یہاں ایک اور نکتہ نظر بھی اسلامی دعوت اور تبلیغ کے بارے میں ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے۔ اس سے مستقبل کے بارے میں کچھ خیال آرائی کرنا ممکن ہو گی۔ اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے کہ شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے بہت سے اسماعیلی فرقے کے بزرگوں نے ایران سے ہندوستان کی طرف تجارت اور اشاعت کے سلسلے میں رخ کیا۔ وہ خشکی کے راستوں سے بھی آئے اور سمندر کے راستوں سے بھی۔ ان کی مساعی کی وجہ سے ایک طرف تو شمال کے دور دراز علاقوں میں مثلاً سوات، چترال، ہنزہ میں اور ان علاقوں سے پار چین کی سرحد تک اسلام پھیلا اور دوسری طرف ہندوستان کے جنوب اور جنوب مشرقی ساحلی علاقوں میں مسلمان آبادیوں کی بنیاد پڑی۔ اسی وجہ سے بعض کھوجہ آبادیوں میں تو یہاں تک مشہور تھا اور ہے، کہ وشنو مہاراج کے دسویں اوتار مسلمان امام ہیں۔ ان عقائد کو ہندو فرقے بھی اس علاقے میں قبول کرتے ہیں۔ اسماعیلی فرقے کے بزرگوں کی مساعی بہرحال شمالی علاقہ جات میں ایسی موثر تھیں اور اب بھی موثر ہیں جن کو آسانی سے نظر انداز کرنا مشکل ہو گا اور یہ عجیب بات ہے کہ ۱۹۰۸ء کے بعد مسلم لیگ کی سیاسی کشمکش میں اسماعیلی فرقے کے سربراہ آغا خان مرحوم کا کردار اتنا مثبت اور موثر رہا ہے کہ قائداعظم کے بعد ان کی قیادت ہی زیادہ موثر ثابت ہوئی اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ اسماعیلی فرقے اور

احمدیہ جیسے دوسرے چھوٹے فرقوں نے کھلم کھلا پاکستان کے نظریے کی حمایت کی جبکہ دوسری مذہبی جماعتوں نے، خاص طور پر دیو بندی اور بریلوی نقطہ نظر کے لوگوں نے من حیث الجماعت پاکستان کے نظریے کی مخالفت کی۔ اس میں خاکسار تنظیم بھی شامل تھی اور احرار تو تھے ہی کانگرس کا لگایا ہوا پودا یہاں تک کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی لاہور شہر میں بنیاد رکھی۔ جبکہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے قرارداد لاہور منظور کی تھی۔ ایک سال بعد مولانا مودودی نے ایک نئی اسلامی جماعت کی بنیاد ڈالی اور اس کی اساس میں یہ بات شامل کی گئی کہ مسلم لیگ کا تصور ''پاکستان'' اسلامی ریاست کی نفی ہے کیونکہ یہ سیکولر نظریات کا حامل ہے۔ اگلے چھ سال وہ بڑی شد و مد سے پاکستان کی مخالفت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۱ء میں بھی مولانا نے پاکستان کو بحیثیت نظریے کے قبول نہیں کیا تھا۔ تبدیلی ۱۹۵۸ء کے بعد آئی جب مولانا نے اپنی سیاست کا رخ بدلا اور اسلامی حکومت کے نفاذ کے لیے پاکستان میں اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ یہی وہ موڑ ہے جو جنوبی ایشیا کی سیاست میں بہت اہم قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی زمانہ ہے جب برصغیر کی سیاست، بالخصوص پاکستان کی سیاست میں، مذہبی بنیاد پرستی، فرقہ وارانہ تنگ نظری اور تشدد نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا اور یہ علاقہ پھر سے ''مذہبی تشدد'' کے دور میں داخل ہو گیا۔

تشدد کی کہانی پاکستان کی زبانی

ہندوستان اور پاکستان کو آزادی اگست ۱۹۴۷ء میں حاصل ہوئی لیکن ۱۹۴۶ء کے اوائل میں ہی ہندوستان کے مختلف صوبوں میں نسلی اور مذہبی تشدد کے واقعات تواتر اور شدت کے ساتھ رونما ہونے لگے تھے۔ ابتدا بنگال کے نوا کھالی کے ضلع سے ہوئی۔ پھر یہ فسادات بہار، اڑیسہ اور دوسرے علاقوں میں یک دم آگ کی طرح پھیل گئے۔ اکثر علاقوں میں قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ یہ فسادات کسی نہ کسی شکل میں ۱۹۴۷ء تک سارے ملک میں نمودار ہوتے رہے اور اگست میں خونی انتقال آبادی کی شکل اختیار کر گئے۔ لاکھوں لوگ دونوں ملکوں سے ہجرت کرتے ہوئے مارے گئے۔ پنجاب کے صوبے کو دولخت کیا گیا۔ دونوں حصوں سے مسلمان، ہندو اور سکھ لاکھوں کی تعداد میں بے گھر ہوئے۔ اپنی جائیدادوں تجارت اور ملازمتوں سے محروم ہوئے اور نامانوس علاقوں میں پہنچ کر کسمپرسی کی حالت میں نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنے پر مجبور کر دیئے گئے۔ تقسیم ہند کے اس سانحے میں پاکستان آنے والے مسلمانوں کی تین اقسام تھیں۔ ایک تو وہ لوگ تھے جنہیں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا گیا۔ ان کی اکثریت مشرقی پنجاب کی تھی۔ جن کو سکھوں اور ہندوؤں نے اسی طرح انخلا پر مجبور کیا جس طرح پاکستان میں وسطی پنجاب کے ضلعوں، مثلاً سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، فیصل آباد، گجرات اور راولپنڈی وغیرہ سے ہندوؤں اور سکھوں کو فسادات کی بنا پر ان کے گھروں سے بے گھر کیا گیا۔ دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جو فساد کی زد میں تو نہیں آئے لیکن اردگرد کی فضا کو دیکھ کر انہوں نے بھانپ لیا کہ آج نہیں تو کل ان کا حال بھی انہی لوگوں جیسا ہو گا، اس لیے وہ ازخود ہجرت کر کے پاکستان آ گ ء۔ ان

لوگوں کی اکثریت بھی پنجاب کے ہندوستانی اضلاع اور راجپوتانہ کے علاقوں سے متعلق تھی۔ تیسری وہ قسم تھی جو پنجاب کے علاوہ دوسرے صوبوں سے فسادات اور دیگر حالات کی خرابی اور یہ محسوس کر کے اب ہندوستان میں پنپنا ان کے لیے مشکل ہے، وہ بہتر معاش اور بہتر معاشرتی حالات کے پیش نظر ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ ان میں ہر قسم کے لوگ تھے، امیر، غریب اور متوسط طبقوں سے تعلق رکھنے والے، ہر ذات ہر نسل کے لوگ جن کا مذاہب ایک تھا یعنی اسلام اور سیاسی نقطہ نظر بھی یہی تھا کہ اب ہمیں اپنی بود و باش کے لیے علیحدہ ملک مل گیا ہے اس لیے اس ملک کی وطنیت اختیار کر کے وہ نئے مستقبل کے معمار بنیں گے۔

اس قیامت خیز اور خوں ریز عظیم ہجرت میں دونوں طرف سے لاکھوں انسان مارے گئے اور لاکھوں بے گھر ہوئے۔ اس طرح برصغیر کے دونوں ملکوں میں خون آشام صبح آزادی نمودار ہوئی۔ ہر قسم کے انفرادی اور اجتماعی تشدد کا دونوں طرف کے عوام کو ایک لمبے عرصے تک سامنا کرنا پڑا۔ ہجرت اور آباد کاری کے مسائل میں ایک طرف مایوسیاں، ناامیدیاں اور طرح طرح کی ناکامیاں مضمر تھیں تو دوسری طرف کچھ طبقوں نے ہر طرح کے تشدد، جھوٹ اور فریب کو بروئے کار لا کر مکاری، عیاری اور دغا بازی کے ساتھ خوب ہاتھ رنگے۔ راتوں رات وہ دولت مند اور سرمایہ دار ہو گئے۔ بڑی بڑی جائیدادوں اور کارخانوں کے مالک بن گئے۔

پاکستان کی آزادی کی دہلیز پر پناہ گزین آبادی کے مسائل کے ساتھ ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی جائیدادوں اور زمینوں، کاروباری اداروں اور کارخانوں کی تقسیم بغیر کسی منصوبہ بندی کے اس افراتفری میں بہت بھونڈے انداز سے عمل میں لائی گئی۔ اس طرح بے پناہ ناانصافی، اقربا پروری اور ظلم و تشدد کی بنیاد ڈال دی گئی۔ پاکستان میں تشدد کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے ان اسباب کا جائزہ لینا ازحد ضروری ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان سے ہندو سکھ آبادی جو بھارت منتقل ہوئی اس کی مجموعی تعداد ۴۰ لاکھ کے قریب تھی اور جو آبادی ہندوستانی علاقوں سے پاکستان میں آئی تھی اس کی تعداد تقریباً ۵۰ لاکھ کے قریب تھی۔ پنجاب اور سندھ اس نقل مکانی سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ سندھ سے ہندو اور سکھ آبادی جو ہندوستان منتقل ہوئی اس کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔

لیکن سندھ میں ہر سال تین سے چار لاکھ لوگ مختلف راستوں سے پہنچنے شروع ہو گئے۔ چند ہزار لوگ صوبہ سرحد اور بلوچستان بھی منتقل ہوئے جن کی وہاں جان پہچان یا عزیز و اقارب تھے۔ اس افراتفری میں صحیح اعداد و شمار کا موجود نہ ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہیں لیکن اس عظیم ترک وطن کے سانحہ میں برصغیر کے لیے بہت سے سنگین مسائل پیدا ہوئے جن کے دور رس نتائج دونوں ممالک کی نفسیات پر مرتب ہوئے۔ یہ عوامل خاص طور پر جذباتی سطح پر پاکستان میں تشدد کے عوامل کو ہوا دینے کا باعث بنے۔ املاک، جائیدادوں اور زمینوں کی تقسیم کا مسئلہ جو کہ تارکین وطن کی جائیدادوں کے سلسلے میں رونما ہوا اس سے تشدد کے کئی پہلو قومی سطح پر سامنے آئے۔ لوٹ کھسوٹ کا تشدد تو برپا ہوا ہی لیکن اخلاقی سطح پر یہ عظیم نقصان ہوا انسانی زندگی کی قدر و قیمت بھی فسادات کی بھینٹ چڑھ گئی۔ انسانی جان کی ارزانی کے علاوہ قتل و غارت گری کے لیے قومی ضرورتوں کا مسئلہ بھی تھا۔ یعنی قوم کے لیے ہر جرم اور فساد جائز ہے۔ یہ ایک ایسا سبق تھا جس نے قومی سطح پر ہمیں بہت نقصان پہنچایا۔ اخلاقی پستی اور گراوٹ کی روایت ہماری قومی بنیادوں میں سرایت کر گئی۔ ناانصافی، مجرمانہ غفلت اور جعل سازی اور مکاری کے اصول گھر گھر عام ہو گئے۔ معاشرہ اخلاقی طور پر بے حجاب اور بے وقار ہو گیا۔ جزا کے سب طالب بن گئے۔ سزا برداشت کرنا، صعوبت کو سہنا، صبر اختیار کرنا، حکم کو اپنانا یہ سب افسانے اور قصے شمار ہونے لگے۔ تقسیم ہند کی غارت گری سے قومی سطح پر جو منفی نتائج مرتب ہوئے قومی لیڈر شپ نے بھی اس طرف دھیان نہیں دیا۔ اس کو بھی صرف یہ احساس تھا کہ انتظامی امور کو دفتری لوگوں کی نگرانی میں جلد سے جلد طے کر دیا جائے۔ یہ کسی نے دھیان نہیں دیا کہ آزادی کے سنگم پر جو قیامت ٹوٹی ہے اس سے قوم کو اخلاقی اقدار کی طرف متوجہ کیا جائے۔ قربانی کا جذبہ ان میں کس طرح مستحکم کیا جائے۔ سیاست دان خوجد بھی اقتدار کی سیڑھیوں پر برق رفتاری سے چڑھنا چاہتے تھے۔ صوبائی سطح پر نواب ممدوٹ، مسٹر گورمانی اور دولتانہ اور مرکزی سطح پر غلام محمد، چوہدری محمد علی اور سکندر مرزا سب رتبوں اور عہدوں کے ذریعہ ترقی کی تلاش میں تھے۔ ان کو قومی اخلاق اور قومی نفسیات کی زبوں حالی کا احساس بالکل نہیں تھا۔

جب مال و متاع اور دولت کے حصول کے لیے، ملازمت اور عہدے کے لیے تمام اخلاق اصول قربان کر دینے کی روایت پڑ جائے، تو پھر جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا

کلیہ قومی سطح پر اپنا لیا جاتا ہے۔ پھر شہری حقوق، سماجی اصول اور معاشرتی فرائض اور ذمہ داریاں سب پس پشت ڈال دی جاتی ہیں۔ یہ وہ وبا تھی جو شروع سے ہی پاکستانی معاشرے میں پھیل گئی۔ قانون اپنے ہاتھوں میں لے کر جس طرح جی چاہے استعمال کرنے کا جذبہ ہر چھوٹے بڑے شہری میں خوب پروان چڑھا اور ہمارے اجتماعی شعور اور لاشعور کا متحرک حصہ بن گیا۔ ہمارے معاشرے کے لیے قومی سطح پر تشدد کی فضا کو پنپنے کے لیے اس سے بہتر اور کیا ماحول مل سکتا تھا۔

خاص طور پر جب ۱۹۴۸ء میں بابائے قوم انتقال کر گئے اور تین سال بعد قائد ملت نواب زادہ لیاقت علی خاں کو ایک سازش کے تحت شہید کروا دیا گیا اور قاتل کو پولیس نے موت کے گھاٹ اتار دیا تاکہ سازش کا پتہ نہ لگایا جا سکے۔ یہ خونی سازش، تشدد کی روایت کی ابتدا تو نہ تھی لیکن انفرادی سطح پر یہ قتل محض ایک وزیراعظم کا قتل نہیں تھا بلکہ جمہوری روایت کا قتل تھا۔ جو پیش خیمہ تھا ان تمام قومی حادثات اور سانحات کا جو ہماری قومی زندگی میں اگلے پچاس سال میں ایک ترتیب کے ساتھ پے بہ پے پیش آتے رہے۔ ان صدموں کی ساری تاریخ تو بیان نہیں کی جا سکتی لیکن تشدد کی کہانی پاکستان کی زبانی بیان کرنے کے لیے ان ادوار کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ چاہے یہ انفرادی واقعات، انفرادی تشدد کی نشاندہی کرتے ہوں یا کسی لسانی یا نسلی فساد کی صورت اختیار کرتے ہوں، یا ان کی نوعیت سیاسی اور معاشرتی ہو، یا پھر وہ کسی کے قتل میں ہوں یا کسی سازش کی شکل میں ہوں، یا آئین کی پامالی کی صورت ہوں، ان واقعات کا مندرجہ ذیل ادوار کی صورت میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ۱۹۴۷ء کے آئین کے بعد ۱۹۵۶ کا ابتدائی دور
۲۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کے بعد ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۵ء تک کا دور
۳۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ اور بھٹو ازم
۴۔ ۷۰۔۱۹۷۱ء، مشرقی پاکستان کا المیہ۔ نسلی اور لسانی تعصب کا سندھ میں فروغ
۵۔ جنرل ضیا الحق کا دور۔ ۱۹۷۷ء سے لے کر ۱۹۸۸ء تک مذہبی تشدد کی داغ بیل
۶۔ کراچی اور ایم کیو ایم......ایک تجزیہ
۷۔ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۶ء تک
۸۔ محترمہ بے نظیر اور جناب نواز شریف دور حکومت............''58BII'' کی فرم

فرمائی!

۹۔ دہشت گردی اور انار کی طرف سفر۔ قانون اور آئین کی پامالی اور اقتصادی بدحالی اور بداعمالی

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک کے ابتدائی سال

صرف ایک سال ہی پاکستان کو قائداعظم کی قیادت نصیب ہوئی۔ قائداعظم کی بے وقت وفات نے شروع سے ہی سیاسی خلا کی صورت اختیار کر لی۔ قائد ملت لیاقت علی خان نے وزیراعظم کی حیثیت سے قائداعظم کے نقش قدم پر چلنے کی اہمیت کو تو ضرور محسوس کیا لیکن تقسیم ہند کے سنگم پر جو خون کا سیلاب اُمڈ آیا تھا اور اخلاقی اقدار کی جو بیخ کنی ہوئی تھی اور پاکستانی قوم کے منہ کو جو خون لگ گیا تھا، ان کے سدباب کے لیے قومی سطح پر کوئی سیاسی اور حکومتی پالیسی اور عملی اقدام نہ کر سکے۔ قومی سطح پر چھوٹے بڑے سب حکمران حکومت کی ترنگ میں ایک سمتی اور سرشاری کے عالم میں ہنگامی صورت حال سے نبرد آزما رہے۔ اس طرح روز اول سے ''ایڈہاک ازم'' کا رواج ہماری قومی زندگی کا ایک جانا پہچانا معمول بن گیا۔ یعنی حالات کا مقابلہ معروضی صورت حال میں جس طرح ممکن ہو کرو۔ اس کے لیے جو بھی اسباب مہیا ہوں، اچھے یا برے، سب استعمال کر لو۔ وقت گزارو اور آگے بڑھو اس رویہ نے ہماری زندگیوں میں بے اصولی، وقتی فائدوں اور ''ڈنگ ٹپاؤ'' رویوں کو فروغ دیا۔ بے شک اس دور میں لوگوں نے ہر طرح کے حالات سے صبر شکر اور حوصلے کی فضا میں مقابلہ کیا۔ انفرادی اور اجتماعی قربانیاں بھی دیں۔ لیکن منظم سطح پر حکومت وقت انتظامی، اخلاقی اور سیاسی کوئی ایسا لائحہ عمل اور ضابطہ اخلاق نہیں پیش کر سکی جو قوم کی اخلاقی بنیاد مضبوط کر سکتا۔ اس لیے انتظامیہ کی چھوٹی بڑی شاخوں نے اپنی من مانی کرنا ایک روز مرہ کا معمول بنا لیا۔ اس وجہ سے پاکستانی انتظامیہ ہر سطح پر زیادہ ہی آزاد خودمختار ہو گئی۔ ان میں آمرانہ اور اصول سے بے پرواہی کا رجحان پیدا ہو گیا۔ اس سے قوانین کو خاطر میں نہ لانے کا رویہ روز بروز بڑھتا گیا۔ اس طرح اخلاقی، سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک ''تشدد'' کا رویہ ہمارے قومی کردار میں راسخ ہوتا گیا۔

آزادی کے تین سال بعد ۱۹۵۰ء میں ہندوستان میں پھر نسلی اور مذہبی فسادات

پھوٹ پڑے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پاکستان سے جو لوگ ہجرت کر کے ہندوستان چلے گئے تھے ان میں خاصی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو پاکستان میں اقتصادی لحاظ سے خاصے آسودہ تھے۔ ہندوستان کے معاشی حالات ان کے لیے بہت ناخوشگوار تھے۔ وہاں جب مسلمانوں کی آبادیوں کو ابھی تک ان لوگوں نے آباد دیکھا تو ان کے ہاں تشدد اورانتقام کا جذبہ ابھرا۔ چنانچہ مسلمان آبادی پرظلم وستم کے دور کا ایک نئے انداز سے آغاز ہوا۔ پاکستان میں ردعمل کے طور پر سندھ میں جو ہندو آبادی تھی وہاں بھی فسادات پھوٹ پڑے۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں بھی ردعمل ہوا۔ وہاں بھی لوگوں نے محسوس کیا کہ کیوں نہ ہندو بنئے اور ساہوکار کو مشرقی پاکستان سے دھکیل کر کچھ اقتصادی فائدے حاصل کیے جائیں۔ یہاں مادی فائدوں کے حصول کی بات تھی، اخلاقی اقدار کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہی رویہ بنیادی طور پر تشدد کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔

انہی اسباب کے پیش نظر ''لیاقت نہرو پیکٹ'' ۱۹۵۱ء میں دہلی میں طے پایا۔ اس کے بعد دونوں ملکوں میں یہ امید بندھی کہ اب شاید مذہبی اور علاقائی تشدد کو کنٹرول کیا جا سکے گا۔ لیکن اس دوران پاکستان میں کچھ اورعوامل اس انداز سے ابھرے کہ تشدد پر قابو پانا آسان کام نہ رہا۔

اس وقت تک پاکستان کی سیاست میں دو طبقے ابھر کر سامنے آ چکے تھے۔ ایک تھا سیاست دانوں کا طبقہ۔ جن میں اکثریت بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کی تھی۔ چاہے وہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے یا مشرقی پاکستان سے، چاہے وہ مغربی پاکستان کے خان، نواب زادے یا صاحبزادے تھے یا مشرقی پاکستان کے خواجے اور نواب، دونوں طرف سے پاکستان کی سیاست میں یہی لوگ سرگرم عمل تھے۔ قیام پاکستان کی تحریک کی سربراہی بھی کم وبیش ان کے ہاتھ میں تھی۔ دوسرا طبقہ تقسیم ہند کی عبوری حکومت کی ہنگامی ضروریات کے مطابق ابھر کر سامنے آیا تھا۔ ان میں تین چار لوگ قومی شہرت اختیار کر چکے تھے۔ ان میں چوہدری محمد علی، ملک غلام محمد، جی فاروق اور سکندر مرزا وغیرہ شامل تھے۔ پہلے دو حضرات کے پیچھے خاصی لمبی قطار تھی جو سرکاری ملازموں کی تھی۔ ان کے ساتھ ان کے اپنے مفادات وابستہ تھے۔ یہ گروہ ایک ''لابی'' اور ''مافیا'' کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ اس کی طرف دھیان دینے کے لیے سیاست دانوں کے پاس نہ تو ادراک تھا اور نہ ہی فرصت

اور نہ ہی تربیت۔ یہ ''بابو لوگ'' دفتروں کے پاس نہ تو ادراک تھا اور نہ ہی فرصت اور نہ ہی تربیت۔ یہ ''بابو لوگ'' دفتروں میں بیٹھ کر فائلوں پر سیاست دانوں کی ''قابلیت'' کے نمونے، ہر آئے گئے کو دکھا کر ان کی ''کارکردگی'' کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے تھے۔ اس طرح یہ ''مافیا'' سیاست دانوں کے خلاف عمل پیرا ہو گیا تھا۔ ادھر کشمیر کا مسئلہ نازک صورت اختیار کر چکا تھا۔ ہندوستان کی فوج کشی کے بعد پاکستان نے جو اقدام ہنگامی حالات میں کیے وہ ناکافی اور ناتسلی بخش تھے اور پھر انگریزوں کا یہ خبط کہ متحدہ ہندوستان میں ان کی تعمیر شدہ فوج کو، جس کی کمان اس وقت بھی پاکستان اور ہندوستان کے متفقہ عبوری سپریم کمانڈر جنرل آکن لیک کے پاس تھی، کوئی نقصان نہ پہنچے۔ (پاکستان میں تو فوج کا کمانڈر انچیف بھی انگریز ہی تھا۔) وہ نہیں چاہتے تھے کہ دونوں ملکوں کی فوجوں میں آزادی کے آغاز میں ہی سنگین ٹکراؤ ہو جائے۔ اس لیے ان کی طرف سے ایسی حکمت عملی اپنائی گئی کہ خان لیاقت علی خاں کشمیر کے متعلق کوئی ٹھوس عملی اقدام نہ کر سکے۔ سرکاری ملازمتوں والے مافیا نے اس کا فائدہ اٹھایا اور ملک میں ایسی فضا جان بوجھ کر پیدا کی جس سے حکومت کے خلاف جذبات نے شدت اختیار کر لی۔ اسی ماحول میں لیاقت علی خاں کو ''شہید'' کر دیا گیا۔ اس سے پہلے ''راولپنڈی سازش کیس'' کی بنیاد بھی اسی مافیا نے ڈالی تھی۔ بظاہر یہی نظر آیا کہ ایک پاگل شخص، سید اکبر کی گولی سے قائد ملت کو ختم کیا گیا لیکن اس کے پیچھے ایک گہری سازش تھی۔ اس سازش کے بارے میں کئی کمیٹیاں اور کئی کمیشن بنائے گئے لیکن کسی ایک کی رپورٹ بھی ''منظر عام'' پر نہیں لائی جا سکی کیونکہ نوکر شاہی ''مافیا'' کے مفاد میں یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ سازشوں کے بارے میں قوم کو آگاہ کیا جائے۔ چاہے وہ ''راولپنڈی سازش'' ہو یا لیاقت علی کا ''قتل'' یا کوئی اور کمیشن یا رپورٹ۔ مثلاً مشرقی پاکستان کے المیے کے بارے میں حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ ۲۰ سال بعد بھی صیغہ راز میں ہے۔ اسی طرح اور کئی قسم کی سازشوں اور ہنگاموں پر کمیشن اور انکوائری کمیٹیاں قائم کی گئیں لیکن ان کو بعض وجوہ کی بنا پر جان بوجھ کر قومی شعور سے کاٹ کر رکھ دیا گیا۔ یہ بھی ''تشدد'' کی فضا کو اور مستحکم کرنے کے ذرائع ہوتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ابھی تک ''اوجڑی کیمپ'' کے سانحے کی رپورٹ شائع نہیں کی گئی؟ اس طرح قومی شعور کو ''نسیان'' کا شکار بنایا جاتا ہے۔ اسی ''نسیان'' سے نفسیاتی طور پر تشدد کا لاشعوری جذبہ ابھرتا ہے۔ فرد کی ''حیثیت'' میں بھی اور قوم کی اجتماعی ''شخصیت'' میں بھی!

جب ۱۹۵۱ء میں ''سید اکبر افغانی'' کی گولی سے ایک سازش کی بنا پر ''قائد ملت'' کو ''شہید ملت'' بنا دیا گیا تو وہ گولی جو لیاقت علی خاں پر چلوائی گئی وہ انفرادی تشدد کے ساتھ گروہی تشدد کی بھی بدترین مثال تھی اور جس طرح ''سید اکبر'' کو لیاقت باغ میں انہی لمحوں میں پولیس کے ایس کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اس سے صاف ظاہر تھا کہ پاکستان میں ''سیاسی قتل'' کو تشدد کی ایک خوفناک صورت میں اپنانے کی طرح ڈال دی گئی ہے۔ اس سے یہ بھی صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ چند نیم سرکاری اور نیم سیاسی حلقے دل برداشتہ ہو کر دیدہ دانستہ اس قیادت کو نقصان پہنچانے کے درپے تھے جس نے پاکستان کو ایک آزاد ریاست بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد جب لیاقت علی خاں کا قتل ہوا تو اس وقت پاکستانی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خاں نے یو این او کے پلیٹ فارم سے یہ بیان جاری کیا تھا کہ ''قاتل کی یہ گولی'' جس نے لیاقت علی خاں کو شہید کیا ہے، دراصل بہت دور رس نتائج کی حامل ہو گی۔'' اس سے پاکستان کی سیاست میں بنیادی تبدیلی لانے کے عزائم ظاہر ہو رہے تھے جو کہ بعد میں آنے والے حالات سے عیاں ہو گئے! قائداعظم کے رفقا کو جلد سے جلد اقتدار سے سبکدوش کیا جا رہا تھا۔

۱۹۵۱ء کے بعد خواجہ ناظم الدین اور ان کے رفقا بشمول وزیر خارجہ کے خلاف جو سیاسی عزائم ابھر کر سامنے آئے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اسی سال پاکستان میں مجلس احرار کراچی میں دوبارہ تشکیل دی گئی۔ یہ وہی مجلس احرار تھی جس نے پاکستان کی ہر ممکن مخالفت کی تھی۔ پھر ۱۹۵۳ء میں اس کی تخریبی سرگرمیوں کا تذکرہ ''منیر کیانی کمیشن'' کی رپورٹ میں نظر آیا۔

۱۹۵۲ء میں خواجہ ناظم الدین اور چوہدری محمد علی کی کمزور حکمت عملی کے باعث مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کے سیاسی زوال کے دور کا آغاز ہو گیا۔ مسلم لیگ کو ''متحدہ محاذ'' نے چوہدری فضل حق (شیر بنگال) کی سرکردگی میں شکست فاش دی۔ یہاں سے پاکستان کی مرکزی حکومت کی بعض مالی اور تجارتی پالیسیوں کے خلاف مشرقی پاکستان میں شدید ردعمل کا آغاز ہوا۔ انہی عوامل کی وجہ سے پنجاب میں ممتاز دولتانہ اور کچھ اور مرکزی وزیروں اور مشیروں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ناظم الدین اور ظفر اللہ خاں کے خلاف جو لیاقت علی خاں کے بعد مسلم لیگی قیادت میں نمبر دو اور تین تھے، ہنگامہ آرائی کی جائے اور

کسی نہ کسی طرح ایک سیاسی پتھر سے دو شکار کیے جائیں۔

۱۹۵۳ء کے مذہبی فسادات اسی خواہش اور سازش کا شاخسانہ تھے۔ اس بحث میں زیادہ الجھنا اس وقت موزوں نہیں لیکن منیر کیانی کمیشن کے کچھ اقتباسات پیش کرنا ضروری ہیں کیونکہ ان فسادات کے پس منظر میں جو کچھ کارفرما تھا اس رپورٹ نے اسے حکیمانہ اور عادلانہ انداز سے اجاگر کیا ہے۔

۱۔ چھ مارچ ۱۹۵۳ء کو جو کچھ ہوا، اس دن کے واقعات کو دیکھ کر ''سینٹ بارتھولومیو ڈے'' کا منظر یاد آتا ہے۔ سول حکام جو عام حالات میں قانون و انتظام کے قیام کے ذمہ دار ہوتے ہیں، کامل طور پر بے بس ہو چکے تھے اور ان میں ۲ مارچ کو پیدا ہونے والی صورت حال کا مقابلہ کرنے کی کوئی خواہش اور اہلیت باقی نہ رہی تھی......

(صفحہ۲ اور۳ اور حاشیہ۔ ''تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ پر ایک نظر'')

۲۔ تحریک کے بانی احرار تھے: رپورٹ میں یہ تسلیم کیا گیا کہ احمدیہ فرقہ کے خلاف تحریک کے بانی اور اسے چلانے والے احرار تھے۔ فاضل جج کہتے ہیں:

مرکزی حکومت کے سرکاری اعلان میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ احمدیوں کے خلاف شورش کو احراریوں نے منظم کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس معاملے میں جارحیت کے ذمہ دار احرار ہیں اور اس پورے مناقشے کے بانی مبانی بھی وہی ہیں۔ حکومت صرف احرار کی برپا کی ہوئی شورش کو روکنے کی غرض سے احرار ہی کو لگام دینا چاہتی ہے......

سول بغاوت کا سارا سروسامان احرار ہی کا کیا دھرا تھا۔ آل مسلم پارٹیز کانفرنس بھی احرار ہی کی ساختہ پرداختہ تھی۔

(رپورٹ صفحہ ۲۷۷ اور رپورٹ صفحہ ۱۴۹)

۳۔ احرار اب بھی پاکستان کے دشمن ہیں: تحقیقاتی عدالت اپنی رپورٹ میں ایک ثابت شدہ حقیقت کے طور پر یہ تسلیم کرتی ہے کہ احرار پاکستان کے مخالف تھے اور اب بھی مخالف ہیں۔

فاضل جج لکھتے ہیں:

خواجہ ناظم الدین نے احرار کو پاکستان دشمن قرار دیا اور وہ اپنی گزشتہ سرگرمیوں کی وجہ سے اسی لقب کے مستحق تھے۔ ان کے بعد کے رویے سے یہ ثابت ہو گیا کہ نئی مملکت کے وجود میں آنے کے بعد وہ اس کے احرار کے ماضی سے ظاہر ہے کہ وہ تقسیم سے پیشتر کانگرس اور ان دوسری جماعتوں سے مل کر کام کر رہے تھے جو قائداعظم کی جدوجہد کے خلاف صف آرا ہو رہی تھیں۔ جماعت نے اب تک پاکستان کے قیام کو دل سے گوارا نہیں کیا۔

(رپورٹ ۲۷۷ اور صفحہ ۲۷۸)

فاضل جج لکھتے ہیں:

مولوی محمد علی جالندھی نے ۱۵ فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور میں تقریر کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ احرار پاکستان کے مخالف تھے اور ان کے عقیدے کی وجوہ عنقریب لوگوں پر ظاہر ہو جائیں گی۔ اس مقرر نے تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد بھی پاکستان کے لیے پلیدستان کا لفظ استعمال کیا اور سید عطا اللہ شاہ بخاری نے اپنی تقریر میں کہا ''پاکستان ایک بازاری عورت ہے جس کو احررا نے مجبوراً قبول کیا ہے۔''

(منیر کیانی رپورٹ صفحہ ۳۷۵)

۴۔ سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر مذہب کا ناجائز استعمال: رپورٹ اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ مذہبی عناصر نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے مذہب کو آلہ کار بنایا اور ایک حربہ کے طور پر استعمال کیا۔

اسلام ان کے لیے ایک حربے کی حثیت رکھتا تھا۔ جسے وہ کسی سیاسی مخالف کو پریشان کرنے کے لیے جب چاہتے بالائے طاق رکھ دیتے اور جب چاہتے اٹھا لیتے۔ کانگرس کے ساتھ سابقہ پڑنے کی صورت میں تو ان کے نزدیک مذہب ایک نجی معاملہ تھا اور وہ نظریہ قومیت کے پابند تھے لیکن جب وہ لیگ کے خلاف صف آرا ہوئے تو ان کی واحد مصلحت اسلام تھی۔ جس کا اجارہ انہیں خدا کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ ان کے نزدیک مسلم لیگ اسلام کی طرف سے بے پرواہ ہی نہ تھی بلکہ دشمن اسلام بھی تھی۔ ان کے نزدیک قائداعظم کافراعظم تھے۔

(رپورٹ صفحہ ۴۷ ۴)

بہرحال ۱۹۵۳ء میں پنجاب کے فسادات کی بنا پر جناب دولتانہ کی حکومت کو معذول کر دیا گیا اور مقامی مارشل لا کا پہلی دفعہ پاکستان میں تجربہ کیا گیا تو ایک ایسی تبدیلی تھی جو پاکستان جیسی نوزائدہ مملکت کے لیے دور رس نتائج کی حامل تھی۔ یہ آئینی طور پر ''تشدد'' کے اجرا کی مظہر تھی۔ ''مارشل لا'' کو ایک ہتھیار کی صورت میں استعمال کرنے کا رجحان پاکستان میں پرورش پا رہا تھا۔ اس کے پیچھے کچھ اور سیاسی عوامل کارفرما تھے جن میں جنرل سکندر مرزا اور جنرل ایوب خاں شعوری اور لاشعوری سطح پر اپنے مخصوص کارندوں سمیت ملوث تھے۔

مارشل لا کے نفاذ کے ساتھ بنیادی انسانی حقوق کسی نہ کسی رنگ میں معطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فوجی قوانین کی صورت میں مارشل لا انتظامیہ کی سول حکام پر برتری مسلم ہو جاتی ہے۔ فوجی اداروں میں اپنی بے جا قوت، طاقت اور شوکت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور پھر یہ ایسا امر ہے جس کے اثرات ہر طبقے میں محسوس کیے جاتے ہیں۔ خاص طور پر اس حوالے سے مشرقی پاکستان کی نفسیات پر اگر آپ غور کریں تو آپ پر ظاہر ہو گا کہ فوج میں اس وقت ان کی شرکت اور نمائندگی بالکل برائے نام تھی۔ فوج میں زیادہ تر مغربی پاکستان اور وہ بھی پنجاب اور سرحد کی آبادی کی نمائندگی ہوتی تھی۔ اس لیے مشرقی پاکستان میں طاقت کے اس زوردار سرچشمے اور منبع سے لاتعلق اور منقطع رہنے کا شدید احساس موجود تھا۔ اس کے نتیجے میں بھی مشرقی پاکستان سے سیاسی ردعمل پوری طاقت کے ساتھ ظاہر ہوا جس نے بعد میں پاکستانی سیاست میں تخریب کا پہلو اختیار کیا۔ معاملہ آہستہ آہستہ ''مکتی باہنی'' اور طالب علموں کی متشدد تنظیموں تک جا پہنچا۔ ''سیاسی تشدد'' کے مسائل رفتہ رفتہ گمبھیر ہوتے گئے!

دوسری چیز جو مشرقی پاکستان کے عوام اور بظاہر عوام پسند لیڈر شپ کو کھلنے لگی تھی وہ مغربی پاکستان میں نوکر شاہی اور سول حکام کی اجارہ داری تھی جس کو رفتہ رفتہ بظاہر سیاست دانوں کی نااہلی کی وجہ سے زیادہ وقعت اور اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ نوکر شاہی کا یہ گروہ ملک غلام محمد، چوہدری محمد علی اور سکندر مرزا کی قیادت میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں اپنے کارندوں کی وساطت سے جابرانہ رویوں کا برملا اظہار کرنے میں کوئی

جھجک محسوس نہیں کرتا تھا بلکہ اس کو انتظامیہ رویے کی کامیابی کا دارومدار سمجھتا تھا۔ ''تشدد'' کا یہ رنگ انتظامیہ میں ہی اپنے رنگ ڈھنگ نہیں دکھا رہا تھا بلکہ آئینی سطح پر غلام محمد اور سکندر مرزا کے دور اقتدار میں اس سے سیاسی سطح پر بھی سنگین غلطیاں اور ظلم سرزد ہوئے۔ یہ ظلم آئینی اور سیاسی تشدد کی مثالی شکل کا رنگ رکھتے ہیں۔ یہ سرکاری ملازمتوں کا وہ ٹولہ تھا جن کی تربیت اور سوچنے کا انداز انگریزی استعمال کا پروردہ تھا۔ اس نے یہ رویہ عام کیا کہ پاکستانی سیاسی لیڈر شپ درحقیقت دوسرے درجہ کی قیادت ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں ایک حقارت اور تمسخر کا رنگ قومی سطح پر غالب آنے لگا۔ وہ ان کی نااہلی کے براے میں اپنی محفلوں میں برملا اظہار کرتا تھا۔ اس قیادت کو ہر لحاظ سے کوتاہ نظر، ناقابل اعتبار اور نااہل کہا جاتا تھا۔ خواجہ ناظم الدین اور ان کے رفقا کے بارے میں یہ مشہور کیا گیا کہ وہ ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کے قابل ہی نہیں۔ خاص طور پر بنگالی لیڈر شپ کے بارے میں ان کا رویہ خاصا ہتک آمیز تھا۔ چنانچہ جب لیاقت علی مرحوم کے بعد خواجہ ناظم الدین کو وزیراعظم بنایا گیا تو ملک غلام محمد بنفس نفیس ملک کے مرکزی آئینی عہدے یعنی گورنر جنرل آف پاکستان کی کرسی پر براجمان ہو گئے۔ اس طرح ''آئینی تشدد'' کا راستہ پاکستان کی سیاست میں مزید ہموار ہو گیا۔ پھر ایبڈو اور پروڈا اور اس کے بعد آئین کی معطلی اور پھر دفعہ ''58.BII'' جیسی بدعتوں کی وجود میں لانے میں کوئی خاص دقت محسوس نہیں کی گئی۔

ہندوستان میں آئین کی تشکیل کا کام تو ایک سال میں طے پا گیا۔ 11 اگست ۱۹۴۷ء سے پاکستان قانون ساز اسمبلی کے اجلاس تو ایک خاص تواتر کے ساتھ ہوتے رہے لیکن آئین ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء سے پہلے وجود میں نہ آ سکا۔ اس بحرانی صورت اور سیاسی خلا کی شکل میں ہماری زندگی شدید آئینی تشدد کے صبر آزما دور سے گزری۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس اعصابی اضطراب کی کیفیت سے ہماری قوم کبھی نہ نکل سکی۔

بہرحال، آزادی کے نو سال بعد جب ۱۹۵۶ء میں آئین کی ایک صورت سامنے آئی تو اس میں بھی ایسے سقم دیدہ دانستہ رکھے گئے جس سے آئینی ڈھانچہ کبھی مضبوط شکل و صورت اختیار ہی نہیں کر سکا۔ اس میں بنیادی جمہوری اصولوں کو وقتی ضرورتوں اور مصلحتوں کی بنا پر بے دردی سے قربان کر دیا گیا۔ مشرقی پاکستان کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی چار پانچ فیصد اکثریت کو قربان کر دے۔ ''ایک فرد ایک ووٹ'' کے اصول کو بالائے طاق رکھتے

ہوئے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی نمائندگی قومی اسمبلی میں پچاس فیصد دونوں طرف تجویز کر دی گئی۔ اس طرح مشرقی پاکستان کو پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ ہماری اکثریت کو مغربی پاکستان تسلیم نہیں کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے ہاں زبان کے مسئلے اور علاقائی تعصب کو فروغ ملنے لگا۔ شیخ مجیب الرحمٰن جیسے طاقتور طالب علم رہنماؤں نے ان آئینی ناانصافیوں کو خوب اچھالا۔ اس کے ردعمل کے طور پر مغربی پاکستان کے لیڈروں کو یہ ماننا پڑا کہ ملازمتوں میں مشرقی پاکستان کا حصہ بہرصورت پچاس فیصد ہوا۔ ایک طرف سیاست میں Parity Principle یعنی سیاسی برابری کا اصول (اکثریت کے باوجود) مشرقی پاکستان پر ٹھونسا گیا تو دوسری طرف مشرقی پاکستان نے مغربی حصہ پر کوٹا سسٹم نافذ کیا اور ملازمتوں کے حصول کے اور اقتصادی مراعات حاصل کرنے کے لیے جمہوری تقاضوں اور انسانی بنیادی حقوق کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ گویا ''تشدد'' کی فضا جمہوری اداروں پر مسلط دی گئی۔ یہ سب کچھ اصولوں کی قربانی دے کر وقتی تقاضوں اور فائدوں کے حصول کے لیے جا رہا تھا۔ قانون اور انصاف کی بالادستی کو جان بوجھ کر پس پشت ڈالا جا رہا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۳ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی شکست کے بعد حسین شہید سہروردی، فضل حق اور مولانا بھاشانی کو مغربی پاکستان کی لیڈرشپ اور نوکر شاہی کے خلاف اور فوجی جرنیلوں کے خلاف ایک سخت گیر سیاسی فضا قائم کرنے کا موقع مل گیا۔

معاشی اعتبار سے بھی مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں اقتصادی خلیج اور بحران شدت اختیار کرنے لگا۔ اس کی بنیادی سطح پر دو اہم وجوہات تھیں۔ ایک تو مشرقی پاکستان میں بجا طور پر یہ احساس تھا کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد اور ابتدائی عرصے میں پاکستان کے اقتصادی نظام کے استحکام میں مشرقی پاکستان کی پٹ سن کی برآمدات نے بنیادی کردار ادا کیا۔ ۸۵ فیصد برآمدات کی آمدنی اسی سنہری ریشے سے حاصل ہوتی تھی۔ لیکن مشرقی پاکستان کی اندرونی اقتصادی حالت ناگفتہ بہہ تھی۔ نہ تو ''انتقال آبادی'' کی وجہ سے انہیں لوٹ کھسوٹ کا مال ملا تھا جو کہ مغربی پاکستان میں لوگوں نے خوب حاصل کیا تھا، اور نہ ہی انہیں، سوائے جوٹ مل کے ایک دو کارخانوں اور بعد میں کاغذ بنانے کے ایک کارخانے کے، صنعتی ترقی کے مواقع مل سکے تھے۔ وہاں کی مسلمان اکثریت افلاس زدہ ان پڑھ آبادی پر مشتمل تھی۔ جب آزادی ملی تو ان کو خیال تھا کہ اکثریت ہماری

ہے اس لیے ہماری اقتصادی ترقی کا پہلے خیال رکھا جائے گا لیکن مرکزی حکومت چونکہ مغربی پاکستان میں تھی اور دفاع کے مسائل بھی مغربی پاکستان کے تھے اس لیے رسل و رسائل کے ذرائع کی توسیع مغربی پاکستان میں پہلے شروع کی گئی۔ صنعتی کاروبار بھی کراچی میں اسماعیلی آبادکاروں کے طفیل شروع ہوا۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر شک وشبہ اور شکوہ شکایت کی فضا مشرقی پاکستان میں شدت اختیار کر گئی۔ ''زرمبادلہ'' ملتا ''سنہری ریشے'' کی وجہ سے تھا لیکن اس کا استعمال زیادہ مغربی پاکستان میں نظر آتا تھا۔ ''دفاع'' کے اخراجات بھی مغربی پاکستان کے کھاتے میں ہی ڈالے جاتے تھے کیونکہ فوج پنجابی اور پٹھان عناصر پر مشتمل تھی۔

ان حالات اور واقعات کی بنا پر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء کا دور پاکستان کا ابتدائی سیاسی عبوری دور قرار دیا جا سکتا ہے جس میں باقاعدہ آئین کوئی نہیں تھا۔ لیکن ۱۹۵۶ء میں جب آئین سازی ہوئی تو بنیادی جمہوری روایات اور اصولوں پر اتنی سودے بازی ہو چکی تھی اور ملک غلام محمد اور سکندر مرزا جیسے طالع آزماؤں نے اپنے لیے اس میں اتنی گنجائش پیدا کر لی تھی کہ وہ کراچی میں بیٹھ کر مشرقی پاکستان کے صوبے اور مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھ سکتے تھے۔ اس طرح حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں لیکن اقتدار کا جاہ وجلال ان شخصیات کے گرد جھلکتا اور جگمگاتا رہا۔

ایوب خاں کا دور

۱۹۵۶ء کے اسلامی جمہوری آئین کے نافذ ہوتے ہی اس میں تعطل کی کئی صورتیں پیدا ہو گئیں۔ خواجہ ناظم الدین کی معزولی کے بعد محمد علی بوگرا، چوہدری محمد علی، حسین شہید سہروردی اور فیروز خاں نون کی حکومتیں تاش کے پتوں کی طرح گورنر جنرل غلام محمد کے ہاتھوں میں گردش کرتی رہیں۔ کراچی میں سکندر مرزا کے ایما پر تشدد کے چند مظاہرے ہوئے۔ دو تین جلوس سیاسی سطح پر نکالے گئے۔ وزیراعظم سے کہا جاتا تھا کہ امن و امان اور قانون کے نفاذ میں آپ سے سنگین کوتاہیاں ہو رہی ہیں اس لیے آپ مستعفی ہو جائیں۔ اس طرح سیاسی ابتری کی فضا پیدا ہوتی گئی اور تشویش ناک حد تک آئینی بحران میں پیدا ہونے لگے۔

آخر کار دو سال بعد ۱۹۵۸ء میں عین اس وقت جب قومی سطح پر ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت قیام پاکستان کے بعد پہلی بار عام انتخابات کا اہتمام ہو رہا تھا اور یہ ممکن نظر آ رہا تھا کہ دونوں بازوؤں سے ایک منتخب قیادت ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کے قابل ہو جائے گی، طاقت کے چھپے ہوئے خفیہ ہاتھ نے محض ''آئینی تشدد'' کے بل بوتے پر فوجی انقلاب برپا کر کے جنرل سکندر مرزا اور جنرل ایوب کے ہاتھوں سیاست دانوں کو مات دی۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو جنرل ایوب خاں صدر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے روپ میں ملکی سیاست کے افق پر اپنی اصلی شکل میں نمودار ہوئے۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۸ء تک وہ سکندر مرزا کے ساتھ مل کر حکومت کی گردن کو ادھر ادھر مروڑتے رہے تھے۔ اب چونکہ مصر، عراق اور شام میں ایسے انقلابات فوجی سطح پر نمودار ہو چکے تھے، اس لیے برطانوی جمہوری نظام کو الوداع کہنا صدر ایوب اور فوج کے لیے اتنا دشوار نہیں رہا تھا۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک ایوب خاں کے دس سال پاکستان کی تاریخ میں اقتصادی لحاظ سے بہترین سال کہے جاتے ہیں لیکن سیاسی سطح پر آئینی تشدد اور جبر و استبداد کے سبق آموز صورتیں بھی اسی وقت قومی سطح پر ابھر کر ہمارے سامنے آئیں۔ ۱۹۵۸ء کے بعد ایک یونٹ کا قیام دراصل مغربی پاکستان کو متحد کر کے مشرقی پاکستان کے سامنے لا کھڑا کرنا تھا۔ سیاسی ناسمجھی اور ناپختگی کی یہ واضح ترین مثال تھی۔ مشرقی پاکستان میں اسے سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ چار صوبوں کی جمہوری صوبائی اکائیوں کو یک جا کر کے مشرقی پاکستان کے مقابلے میں ایک وحدت کے طور پر سیاست بازی کے لیے استعمال کرنا بنگالی عوام کو کسی طرح بھی قبول نہ تھا۔ عوامی لیگ کو ایک اور سیاسی ہتھیار مل گیا۔ ون یونٹ کے خلاف ان کی مہم لسانی اور نسلی رنگ اختیار کر گئی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک طرح سے یہ گورے اور کالے کی جنگ قرار پائی۔ یہ جنگ غریب اور امیر کی طبقاتی کشمکش کا رنگ بھی رکھتی تھی۔ ادھر مشرقی بنگال کو اپنی دفاعی کمزوری کا احساس بھی پیدا ہونے لگا۔ فوج کی برتری اور پھر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد صدر ایوب کے اس بیان نے کہ مشرقی پاکستان کا دفاع صرف مغربی پاکستان کی مضبوط دفاعی حالت سے ہی ہوسکتا ہے، بنگالیوں میں یہ عقیدہ سیاسی طور پر راسخ کر دیا کہ مشرقی پاکستان کو دراصل مغربی پاکستان کا ایک تمتہ سمجھا جاتا ہے۔ اس احساس کے تحت مشرقی پاکستان میں فوجی نوعیت کی عصبیت بھی بیدار ہونے لگی۔ فوج کا مقابلہ بہرحال فوج سے ہی

کیا جا سکتا ہے۔ اسی دور میں ہندوستان کی سیاسی حکمت عملی نے بھی اپنا رنگ دکھایا اور ان کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جو سبکی انہیں برداشت کرنا پڑی ہے اس کا بدلہ مشرقی پاکستان کے محاذ پر لیا جا سکتا ہے اور یہی کچھ ہندوستان نے مشرقی پاکستان میں کر دکھایا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ اور معاہدہ تاشقند کے بعد مغربی پاکستان میں جو صورت حال ظاہر ہو رہی تھی وہ صدر ایوب کے خلاف تھی۔ کشمیر کے بارے میں سیاسی سطح پر جو سمجھوتہ تاشقند میں طے پایا اس کی وجہ سے ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھ میں ایک سیاسی چال آ گئی جسے استعمال کر کے ان کے لیے پاکستانی سیاست میں اپنا تاریخی مقام پیدا کرنا آسان ہو گیا۔ کشمیر کا معاملہ مغربی پاکستان کے عوام کے لیے عموماً اور پنجاب کے لوگوں کے لیے خصوصاً ایک جذباتی مسئلہ ہے۔ کشمیر کو مغربی پاکستان اپنی ''تقدیر'' کا حصہ سمجھتا ہے۔ کشمیر کا شمالی خطہ پاکستان کی شہہ رگ قرار پاتا ہے۔ پاکستان کے چار دریا، راوی، چناب، جہلم اور سندھ اسی علاقے سے وابستہ ہیں۔ ہمارے پانی کے ذخائر کا منبع کشمیر ہے۔ جنرل ایوب نے ہندوستان سے پانی کا بین الاقوامی سمجھوتہ کر کے پاکستان کے لیے کشمیر کے معاملے کی اہمیت کم کرنے کی ایک کوشش کی تھی، لیکن کشمیر کا مسئلہ سیاسی نوعیت کا زیادہ تھا۔ ۱۹۶۵ء میں صدر ایوب کو اس بات کا قائل کیا گیا کہ کشمیر میں اگر بااثر مزاحمت ہو تو یہ مسئلہ سیاسی اور فوجی اعتبار سے بھی حل کیا جا سکتا ہے۔ یہ رموز مملکت ابھی تک آشکار نہیں ہوئے کہ یہ مرکزی خیال یا مرکزی منصوبہ کس کا تھا۔ بہرحال صدر ایوب نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کو تو شاید ضروری نہ سمجھا لیکن کشمیر میں ''مزاحمت'' یا مداخلت کو تقویت پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہندوستان نے مغربی پاکستان پر ستمبر میں دھاوا بول دیا۔ باقاعدہ جنگ کا اعلان دونوں طرف سے ہوا۔ ہندوستان کے فوجی عزائم پورے نہ ہو سکے۔ فتح و شکست تو کسی کے حصہ میں نہیں آئی لیکن فوجی اعتبار سے پاکستان کا پلہ بھاری رہا۔ جس سے پاکستانی افواج اور پاکستان کے عوام میں ایک حد تک اعتماد کا جذبہ پیدا ہوا لیکن دوسری طرف مشرقی پاکستان میں ردعمل بالکل برعکس تھا۔ ان کا یہ خیال راسخ ہو گیا کہ مشرقی پاکستان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ سارا دارومدار مغربی پاکستان پر ہے۔ یہ ایک ''لاتعلقی'' اور ''لاحاصلی'' کا جذبہ مشرقی پاکستان میں شعوری طور پر سامنے آیا۔ پھر گیارہ نکات کی صورت میں ''بنگلہ دیش'' کا سیاسی تصور پیش کیا گیا۔ ایوب کی حکومت نے مشرقی پاکستان کے مقبول ترین لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر کے اس

پر ''غداری'' کا مقدمہ چلایا۔ اس طرح تشدد کی ایک دیوار پاکستان کے دوحصوں میں حائل ہوگئی۔

سندھ طاس معاہدہ کے بعد طے شدہ اصولوں کے مطابق پاکستان کو امریکہ اور عالمی بین جیسے اداروں سے جو اقتصادی امداد ملی اس کا ۹۵ فیصد استعمال مغربی پاکستان میں دریاؤں پر بند بنا کر کا گیا۔ اس طرح جو اقتصادی ترقی حاصل ہوئی اس کے تمام فوائد مغربی پاکستان کو ہی حاصل ہوئے۔ اس ترقی کو مشرقی پاکستان میں نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا گیا۔ وہاں شدت کے ساتھ احساس محرومی پیدا ہوا۔ غربت اور احساس محرومی جبلی طور پر تشدد کو آواز دیتا ہے۔ ''مکتی باہنی'' جیسے اداروں کا وجود اسی احساس محرومی اور احساس کہتری کا براہ راست نتیجہ تھا۔ تعصب کی دیوار اور تشدد کی فضا مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان رفتہ رفتہ حائل ہوتی گئی۔ ۱۹۶۵ء کے بعد اگلے پانچ سالوں نے سیاسی سطح پر وہ کام کر دکھایا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آخر ۱۹۷۰ء میں پاکستان دولخت ہوگیا۔ کالا پاکستان بنگلہ دیش میں تبدیل ہوگیا اور گورا پاکستان اپنے ادھورے تشخص اور مجروح قومی نظریے کی بقا کے راستے کی تلاش کے لیے پھر سیاسی وادیوں میں سرگرداں ہوگیا۔ لیکن ان پانچ سالوں میں تقسیم ہند کی تاریخ کو مسلمان قوم نے اب خود اپنے آپ پر وار کیا۔ ''تقسیم پاکستان'' کے المیے میں بھی اسی تشدد کو روا رکھا گیا جو قیام پاکستان کے وقت روا رکھا گیا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق مشرقی پاکستان میں فوج کے ہاتھوں پانچ لاکھ افراد موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ ہزاروں افراد مکتی باہنی کے ہاتھوں مارے گئے۔ اور ہزاروں ہندوستانی فوج کے ہاتھوں موت کا شکار ہوئے۔ تشدد کی یہ گرم بازاری تقسیم ہند کے بعد تقسیم پاکستان کی شکل میں ایک دفعہ پھر ہولناک ڈرامائی انداز میں اس خطہ ارض پر نمودار ہوئی۔

دراصل پاکستان کا دولخت ہونا اور بنگلہ دیش کا معرض وجود میں آنا محض سیاسی عمل پذیری نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے کچھ تہذیبی اور تمدنی وجوہات بھی تھیں جن کے اجزائے ترکیبی میں لسانی عوام بھی شامل تھے۔ یہاں اجتماعی لاشعور کی بہت سی قدیم داستانیں اور اساطیر بھی کام کر رہے تھے۔ مغربی پاکستان، آریہ اقوام، انڈو ایرانی میل جول اور کسی حد تک عربی یہودی نسلوں کی قدیم ہجرت کے باعث ایک خاص خطے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ پچھلے دو ہزار سال سے زیادہ عرصے میں اس علاقے میں باہر سے لوگ آ کر یا تو جنگیں

برپا کرتے یا یہاں سے گزر کر ہندوستان کے وسطی علاقوں میں جاتے یا پھر ان علاقوں میں کھیتی باڑی کے لیے آباد ہو جاتے تھے۔ دریاؤں کے کنارے زمین بہت زرخیز تھی۔ مشرقی پاکستان کا خطہ قدیم نسلوں کی آماجگاہ تھا۔ آریائی تہذیب نے ان کو دھکیل کر جنگلوں میں بسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دونوں میں یہ قدیم لاشعور بعد اور مخاصمت کسی سیاسی عمل کے وجود میں آ جانے سے یا وقتی ضرورتوں کی وجہ سے فضائے یاد سے محو ہو گئی لیکن رنگ و نسل کے کرشمے اپنا رنگ دکھاتے ضرور ہیں۔ آپ ان کو یکسر بھلا نہیں سکتے۔ مغربی پاکستان میں ظاہر ہے آریہ اقوام کی لسانی اور نسلی برتری تھی۔ مذہب کی بنا پر ہندو مسلم تقسیم کے پیش نظر آریائی قوم کو آپ دو حصوں میں تقسیم کر کے حکومتی نظام تو چلا سکتے ہیں لیکن اس اصول کی بنا پر آپ آریائی نسل کے لوگوں کو کسی سیاسی نظام میں منسلک کر کے قدیم ہندوستانی نسلوں میں مدغم نہیں کر سکتے۔ مذہب کی بنیاد پر دیر تک نسلی امتیازات کو یکسر نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ قومیت میں نسل اور رنگ ضرور ابھریں گے۔ پاکستان کے دولخت ہونے میں بھی یہ اصول کارفرما تھا۔ ان دونوں تہذیبوں میں زمین آسمان کا فرق تھا اس لیے مذہبی وراثت محض وراثت کے رنگ میں پاکستانی قوم کا دفاع نہ کر سکی۔ مذہبی وراثت اور تہذیبی اقدار، قدیم نسلی بعد اور مخاصمت کی وجہ سے نظر انداز کر دی گئیں۔ مشرقی پاکستان میں مذہب کی پاسبانی کا کام بنیاد پرست عناصر کے ہاتھوں سونپ دیا گیا تھا۔ مسلم لیگ نے اپنے آپ کو اس کام سے فارغ سمجھا۔ بنیاد پرست عناصر تعصب اور مخاصمت تو پیدا کر سکتے ہیں، محبت، یگانگت اور باہمی پیار اور شفقت کی فضا کبھی پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ ''تفریق'' اور فرقہ پرستی کے قائل ہوتے ہیں۔ اتفاق اور اتحاد ان کا پیغام نہیں ہوتا۔ اس لیے مشرقی پاکستان میں ان عناصر کی وجہ سے قومی ٹوٹ پھوٹ کا کام زیادہ سرعت کے ساتھ ہوا۔ آج کل مغربی پاکستان یعنی ہمارے موجودہ پاکستان میں فرقہ پرستی کا رجحان بھی اسی لیے ظاہر ہو رہا ہے اور اس کے نقصانات بھی سامنے آ رہے ہیں۔

قصہ مختصر مشرقی پاکستان میں بنیاد پرست اسلامی جماعتوں کے باوجود مقامی تہذیب نے یونیورسٹیوں میں اور طلبہ اور اساتذہ کی تنظیموں میں زیادہ اثر و رسوخ حاصل کیا اور یورپی کلچر نے وہ یورش اختیار کی جس کے سامنے ''مولویت'' ناکام ہو گئی۔ مشرقی پاکستان میں طلبہ تنظیموں نے ایک مضبوط سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ ان کے پاس سٹریٹ پاور بھی تھی۔

جو کچھ کمی رہ گئی تھی وہ مکتی باہنی کی اسلحہ بردار تنظیم نے پوری کر دی۔ اس طرح تشدد کا ایک بھیانک دور مشرقی پاکستان میں رونما ہوا اور یہ سلسلہ ۱۹۷۰ء تک جاری رہا۔

۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۰ء...... المیہ مشرقی پاکستان اور بھٹوازم کا دور

نومبر ۱۹۶۷ء میں ایوب خاں کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۶۸ء میں صدر ایوب خاں کے خلاف تحریک نے زور پکڑا۔ ۱۹۶۸ء کے آخر اور ۱۹۶۹ء کے شروع میں صدر ایوب نے بالآخر اپنے عہدے سے سبکدوش ہونے کا اعلان کیا اور کہا ''مجھے افسوس ہے کہ دس سال حکومت کرنے کے بعد میں انتقال اقتدار کا مرحلہ جمہوری انداز سے طے نہیں کر رہا ہوں اور ایک مارشل لا سے دوسرے مارشل لا کو اپنی وراثت منتقل کر رہا ہوں۔'' جنرل یحیٰی خاں نے عنان حکومت سنبھال لی۔ صدر ایوب خان اپنے آئین پر بھی عمل نہ کرسکا۔ جنرل یحیٰی خاں نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں ایک عبوری حکومت قائم کی اور ۱۹۷۰ء میں انتخابات کا اعلان کیا۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے علاوہ مسلم لیگ، جماعت اسلامی اور مولانا بھاشانی کی سیاسی پارٹی کا بھی کسی قدر اثر و رسوخ تھا لیکن حالات نے جو رخ اختیار کیا اس سے شیخ مجیب الرحمٰن کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ ادھر مغربی پاکستان میں صدر ایوب کے مستعفی ہونے کے بعد بھٹو ایک قومی ہیرو کی شکل میں عوام کے سامنے آئے۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مشرقی اور مغربی پاکستان میں جو انقلاب رونما ہوا وہ سب کے لیے حیرت انگیز تھا۔ اس سے دونوں طرف یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ مذہبی بنیاد پرستی کی بنا پر جو سیاسی پارٹیاں اپنا پروگرام آگے بڑھانا چاہتی تھیں وہ انتخاب میں زبردست شکست سے دو چار ہوئیں اور پاکستانی سیاست کا جو نقشہ مذہبی بنیاد پرست عناصر کے ذہن میں تھا، اس کے بالکل برعکس نتائج ظاہر ہوئے۔ عوام نے ان کو یکسر مسترد کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ بھاری اکثریت سے جیتی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو جیل میں غداری کے مقدمے کے باوجود مشرقی پاکستان نے ایک محبّ الوطن، مقبول عام لیڈر کے طور پر منتخب کیا۔ ادھر مغربی پاکستان میں جناب بھٹو کی پیپلز پارٹی کو واضح اکثریت حاصل ہوئی۔ اس طرح ''ادھر ہم ادھر تم'' کی سیاست کا آغاز ہوا۔ جنرل یحیٰی خاں نے نہ تو شیخ مجیب الرحمٰن سے

سیاسی سمجھوتہ کیا اور نہ ہی مسٹر بھٹو کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ پارٹی سیاست سے بالاتر ہو کر، اس خلیج کو سیاسی طور پر عبور کرنے کی کوشش کریں۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے کسی سیاست دان نے اس سلسلے میں نہ کوئی مثبت طریقہ کار اختیار کیا اور نہ کسی کو اختیار کرنے دیا۔ دونوں لاشعوری طور پر اس بات پر راضی ہو چکے تھے کہ مشرق اور مغرب کا مل کر رہنا اب ممکن نہیں رہا کیونکہ مشرق بہرحال مشرق ہے اور مغرب تو ہے ہی مغرب۔ دونوں کا ملاپ ہوا بھی تو وہ سیاسی جلد بازی کا نتیجہ تھا۔ جواب ''تیاگ'' کی شکل میں رونما ہو رہا تھا۔ سیاسی حقیقتیں بھی تو آخر فانی ہی ہوتی ہیں۔

۷۰۔۱۹۷۱ء کی جنگ کا کچھ ذکر تو پہلے بھی آ چکا ہے، اس جنگ کے عوامل کا ذکر کرنا یہاں مقصود نہیں۔ تشدد کی انتہائی شکل آخر جنگ کی سطح پر نمودار ہوتی ہے۔ لیکن اس جنگ کے پیچھے صرف پاکستانی فوج، مکتی باہنی اور ہندوستانی فوج کی جارحیت ہی نہیں تھی یہ جنگ نظریات کی بھی جنگ تھی، جو بحیثیت ایک قوم کے ہمیں قبول کرنا ہوگا کہ ہم نے ہاری۔ کیوں ہاری؟ اس کے اسباب پر بحث اس کتاب کا موضوع نہیں۔ لیکن ۹۰ ہزار پاکستانی فوج کا قیدی ہو کر ہتھیار ڈالنا محض ایک المیہ نہ تھا۔ ہمیں اپنے نظریات اور تصورات کا بھی تجزیہ کرنا ہوگا کہ ہماری ناکامی اور خرابی کی صورت کہاں پوشیدہ اور کہاں ظاہر ہے۔ ہم نے کیوں لسانی، نسلی قومی اور مذہبی اور بالآخر سیاسی سطح پر شکست کھائی؟ اس میں ہماری طرف سے تشدد کے کھیل کھیلے گئے جس کے نتائج کا ہمیں شکست کی صورت میں سامنا کرنا پڑا۔ مذہب کے نام پر سیاست جمہوریت کی سطح پر ہو سکتی بھی ہے یا نہیں؟ مذہبی سیاست بالآخر تشدد کی طرف کیوں لے جاتی ہے؟ جمہوری تقاضے کیوں پامال ہوتے ہیں؟ مشرقی اور مغربی پاکستان میں مذہب کے نام پر سیاست کرنے کا یہ ردعمل تھا جو عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کی کامیابی کی صورت میں رونما ہوا۔ ان دونوں چکی کے پاٹوں میں ''مسلم لیگ'' پس کر رہ گئی۔ یہ مسلم لیگ کی اپنی کمزوریوں اور چشم پوشی کا نتیجہ تھا۔ جب آپ کبوتر کی طرح خطرے کو محسوس کر کے آنکھیں بند کر لیں تو بالآخر آپ کے ساتھ یہی کچھ ہوگا جو ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مسلم لیگ جیسی جماعتوں کو پیش آیا۔

بنگلہ دیش بن جانے کی صورت میں باقی ماندہ نصف قومی اسمبلی کی قانونی حیثیت کیا تھی اس پر کسی سیاست دان، کسی قانون دان نے اس وقت نگاہ نہیں ڈالی اور نہ ہی کسی

عدالت نے حرف محرمانہ لکھا یا فیصلہ سنایا۔ باقی ماندہ اسمبلی کو بروئے کار لا کر پاکستان کے لیے ایک عبوری آئین اور پھر ۱۹۷۳ء کے آئین کی شکل میں بھٹو صاحب نے آئین سازی کی اور کامیاب الیکشن لڑنے کے باوجود بعض مجبوریوں کے تحت مذہبی مدرسہ ہائے فکر کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تاکہ متفقہ آئین کا سہرا بھٹو صاحب کے سر پر باندھا جا سکے۔ سو وہ سہرا بھی ان کی زینت بنا۔ لیکن مذہبی دہشت گردی کا رجحان آئینی سطح پر نمودار ہونے کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ پہلی دفعہ مسلمان کی تعریف کی تلاش شروع ہوئی اور آئین میں حلف برداری کے لیے صدر پاکستان اور وزیراعظم پاکستان کو ایک حلف اٹھانا پڑا جس میں ان کے ''مسلمان'' ہونے کی کچھ شرائط کا ذکر بھی رکھا گیا۔ ۱۹۷۳ء میں قرائن ظاہر ہو گئے کہ مسٹر بھٹو بھی مذہبی بنیاد پرستوں سے دب کر ہی اس ملک میں اپنی حکومت کے فرائض سرانجام دیں گے۔

۱۹۷۴ء کے شروع میں ''اسلامک سمٹ'' کی کامیابی بھی ان کو نصیب ہوئی۔ اب مارچ کے بعد مئی ۱۹۷۴ء میں ''ربوہ کے واقعہ'' کی بنیاد پر ایک سیاسی ہنگامہ برپا کیا گیا۔ ربوہ کے واقعہ کے بارے میں جسٹس صمدانی کی رپورٹ کو ابھی تک صیغہ راز میں رکھا گیا ہے لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ جسٹس صمدانی اس نتیجہ پر پہنچے کہ ربوہ کے واقعہ کی نوعیت ہرگز ایسی نہیں تھی کہ اس سے قومی سطح پر امن و امان کا خطرہ لاحق ہوتا لیکن اس واقعہ کو ایسا رنگ کیوں دیا گیا؟ اس کے اسباب پر آج تک کسی نے کھل کر بات کرنے کی جرأت نہیں کی۔ بہرحال اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ ۲۹ مئی ۱۹۷۴ کی سہہ پہر کو یہ واقعہ پیش آیا۔ اگلے دن یعنی ۳۰ مئی کے سرکاری اخبارات نے اس واقعہ کو خوب اچھالا بینر ہیڈ لائن میں یہ خبریں شائع کیں۔ لیکن اپوزیشن کے خیالات کی عکاسی کرنے والے واحد اخبار ''نوائے وقت'' نے اس غیر اہم خبر کی نہ ہونے کے برابر پذیرائی کی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسئلہ بعض رموز مملکت کے تحت وزیراعظم کی اپنی ضرورت تھی۔ وہ ایک بیرونی مسلمان مملکت اور اس سے منسلک مذہبی جماعت کی حمایت حاصل کرنے کے لیے مولانا کوثر نیازی اور شورش کاشمیری کی خدمات پہلے ہی بروئے کار لا چکے تھے۔

چنانچہ ربوہ کے واقعہ کے بعد تشدد کے واقعات تمام ملک میں ظاہر ہوئے۔ جائیدادیں لوٹی گئیں۔ گھر تباہ کیے گئے اور بہت سے لوگ تشدد کا نشانہ بنائے گئے۔ یہ

''مذہبی تشدد'' کا ایک اور روپ تھا جس کو قوم کے سامنے فخریہ انداز میں پیش کیا گیا۔ دراصل یہ مذہبی تشدد کی ایک نئی ابتدا تھی جو ۱۹۷۴ء سے شروع ہوئی اور جس کا اصل زور شور ۱۹۸۱ء میں جنرل ضیاء الحق کے دور میں ظہور پذیر ہوا۔ ۱۹۷۴ء میں پاکستان کو یہ اعزاز بھی نصیب ہوا کہ اس ملک نے اپنے وجود سے ایک نئی اقلیت کو جنم دیا جو اس ملک کی اپنی خود ساختہ تھی۔ کیا آپ اس کو تشدد کا نام دیں گے؟

۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء تک............ جنرل ضیاء الحق اور مذہبی جماعتوں کا فروغ

۱۹۷۴ء کے بعد بھٹو صاحب کو مذہبی عناصر کو بیجا خوش کرنے اور ان میں ہردلعزیز ہونے کے عزائم کے نتائج بخوبی نظر آنے لگے تھے۔ پاکستان کے افق پر تمام مذہبی عناصر اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کی قیادت کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں ''۹ ستاروں'' کا محاذ قائم کر لیا۔ جلسوں جلوسوں اور ہڑتالوں کے ماحول میں تشدد کے واقعات نے ملک میں فروغ پایا۔ کراچی میں ہنگاموں نے زیادہ شدت اختیار کی۔ اس اثنا میں جب قومی انتخابات کا مرحلہ آیا تو قومی متحدہ محاذ یعنی نو ستاروں نے پہلے ہی سے انتخابات میں ممکنہ دھاندلی کے خدشات ظاہر کرنا شروع کر دیئے اور حکومت کو انتباہ کیا کہ اگر دھاندلی ہوئی تو وہ عدم تعاون کی قومی تحریک چلائیں گے۔ چنانچہ انتخابی نتائج کے آنے پر ان کی طرف سے عدم تعاون کی متشدد تحریک کا آغاز کر دیا گیا۔ پاکستان کے تمام بڑے شہروں لاہور، کراچی، ملتان، فیصل آباد، حیدر آباد، راولپنڈی اور پشاور میں نہ صرف فسادات برپا ہوئے بلکہ جان و مال کا نقصان ہر روز کا معمول بن گیا۔ آتش زنی کے واقعات نے اتنی کثرت اختیار کر لی کہ بھٹو حکومت کو جگہ جگہ فوج بلا کر ہنگامی حالت اور کرفیو کا اعلان کرنا پڑا۔ بعض بڑے شہروں میں وقتی طور پر مارشل لا بھی نافذ کرنا پڑا۔ سینکڑوں لوگ مارے گئے، کروڑوں کی سرکاری املاک، بسیں، کاریں اور ریل گاڑی کی بوگیاں تک جلائی گئیں۔ پہلی دفعہ دہشت گردی اور بم بلاسٹ کے واقعات رونما ہوئے۔

اسی اثنا میں جنرل ضیا الحق نے مارشل لا کا نفاذ کیا اور ''نظریہ ضرورت'' کے تحت

ملک کی اعلیٰ ترین عدالت نے اسے قانونی جواز کی سند عطا کر دی۔ ۹۰ دن کے اندر اندر انتخابات کا سلسلہ شروع ہوا لیکن رفتہ رفتہ کئی مہینے گزرتے گئے اور اسی طرح کئی سال ضیا الحق کے مارشل لا کی نذر ہو گئے۔ اس دوران ''ریفرنڈم'' کا سیاسی ڈھونگ بھی رچایا گیا۔ ضیا الحق کے دور اقتدار کی ایک اور خوش بختی اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ افغانستان میں روس کو پسپا کرنے اور ویت نام میں ہاری ہوئی جنگ کا بدلہ لینے کے لیے امریکہ نے اپنے کچھ ساتھیوں سمیت یہ فیصلہ کیا کہ پاکستانی سرکاری ذرائع کے توسط سے افغان مجاہدین کی مدد کی جائے گی۔ اس پالیسی کے نتیجے میں زرمبادلہ اور اسلحہ کی خرید و فروخت کا وسیع کاروبار پاکستان میں شروع ہو گیا۔ جدید ترین اسلحہ افغان مجاہدوں اور افغان مہاجروں کو ملنے لگا جو بالآخر پاکستان میں بھی پھیل گیا۔ اس طرح اسلحہ کی تجارت نہ صرف سرحد کے صوبے میں شدت سے در آئی بلکہ افغان مہاجروں کے ذریعہ یہ کراچی میں ایم کیو ایم کی تحریک تک بھی پہنچ گئی اور اس طرح ''تشدد'' کے جدید ترین ہتھیار ملک کے کونے کونے تک پہنچ گئے! ان حالات سے فائدہ اٹھانے کے لیے فوجی قیادت نے کس قسم کے منصوبے اور کیا حکمت عملی مختلف قومی سطحوں پر اختیار کی اس کے تجزیئے کے لیے یہ مطالعہ کسی طرح موزوں نہ ہو گا۔ لیکن چلیے یہ مان بھی لیا جائے کہ اس وقت کے ''معروضی سوالات'' کے مطابق شاید پاکستان کے لیے کوئی اور چارہ ہی نہ تھا۔ لیکن تشدد کی تجارت کو اپنے ملک میں بے دریغ پھیلنے دینا تو ملک سے وفاداری نہیں ہو سکتی۔ یہ امن و امان کی فضا کو تباہ کرنے کی سوچی سمجھی سکیم نہ تھی تو پھر بہت احمقانہ اور مفاد پرست حکمت عملی ضرور تھی۔ اگلے پانچ سال میں ہی یہ ظاہر ہو گیا کہ پاکستان میں ''دہشت گردی'' اور خون خرابے کے فروغ کی اصل ذمہ داری اسی حکمت عملی پر جاتی ہے۔ بے شک ہمارے لاشعور میں اور شاید شعوری طور پر بھی یہ بات تھی کہ آج اگر افغانستان کو اسلام کے نام پر مجاہد فتح کر سکتے ہیں تو کل اسلام کے نام پر ان جیسے یا یہی مجاہدانہ عناصر کشمیر میں بھی انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ اس طرح کشمیر کی جنگ آزادی اور سیاسی جدوجہد عظیم کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ذہنی، جذباتی اور اقتصادی فوائد اس جنگی ساز و سامان سے وابستہ تھے وہ آپ ''اوجڑی کیمپ'' کے تناظر میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کیمپ کی بربادی کے سلسلے میں جو رپورٹ سرکاری سطح پر تیار کی گئی تھی وہ پردہ راز میں رکھ کر قوم کو ''خود شناسی'' سے محروم رکھا جا رہا ہے لیکن اس سے کسی کو

انکار نہیں کہ قومی سطح پر اسلحہ کے کاروبار نے کئی قسم کی ذہنی اور سماجی بیماریوں کا آغاز کیا۔ ''ہیروئن'' کی تجارت کے مہلک اثرات تمام ملک میں پھیل گئے۔ اسلحہ اور منشیات کی درآمد اور برآمد سے وابستہ غیر ملکی زرمبادلہ کا ہیر پھیر اور کرنسی کی قدر و قیمت کا مسلسل زوال اور اخلاقی قدروں کی گراوٹ اور تشدد کے واقعات کی کثرت سے اس ملک کی معاشرتی زندگی کو ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۷ء تک مکمل طور پر زبوں حالی کا شکار کر دیا۔ ہم بحیثیت قوم اخلاقی سطح پر مفلوج ہو کر رہ گئے۔ ایک ایسی قوم جو نشے کے عالم میں خود فریبی اور تن آسانی کا شکار ہے، جو مکمل جھوٹے ذرائع ابلاغ کے چنگل میں گرفتار ہے۔ ہم بحیثیت قوم اپنی ہی ''خوش فہمی'' کے اسیر ہو گئے۔

اسلام کے نام پر افغانستان کی جنگ کے اغراض و مقاصد قومی نقطہ نظر سے کتنے ہی ولولہ انگیز اور مجاہدانہ کیوں نہ ہوں اور جنرل ضیا اور جنرل اختر عبدالرحمٰن نے اس منصوبے سے کتنے ہی قومی فائدے حاصل کیے ہوں لیکن مغربی استعمار اور اس کے ہم نواؤں نے پاکستان کی سرحد پر درہ خیبر کے سائے میں افغانستان اور افغانوں کے لیے جو نہ ختم ہونے والا محاذ جنگ کھولا اور ''جہاد'' کی جس تجارت کا آغاز یا وہ ۱۵ سال بعد بھی اسی طرح تر و تازہ اور توانا ہے۔ افغانستان کے افغان مجاہدین ہوں یا طالبان سب آپ میں اس طرح گتھم گتھا ہیں کہ اس سے زیادہ ولولہ خیز اور کوئی کام نہیں۔ اپنے بھائیوں کی گردنیں جس طرح کاٹی جا رہی ہیں اس سے زیادہ عملی طور پر ثواب کا کام اور کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ مذہبی تشدد اور سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے تو ابھی تک بہتری کا کوئی دن طلوع نہیں ہوا۔ پاکستان میں اسلحے اور ''ہیروئن'' کے کاروبار سے جو سنگین نتائج برآمد ہو رہے ہیں وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں! جنرل ضیا الحق کا گیارہ سالہ دور حکومت مذہبی تشدد کے فروغ کا مہلک ترین دور ہے۔ جس طرح اس حکومت نے اس سنگین صورت حال کا حوصلہ افزائی کی اس کی مثال تمام اقوام عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ تجاہل عارفانہ اختیار کر کے ہی مذہبی تنظیموں کو مسلح کیا گیا۔ مال و منال اور زرمبادلہ کے منہ ان تنظیموں کے لیے کھول دیئے گئے۔ اس میں مشرق وسطیٰ کی تجارتی منڈیوں کے علاوہ وہاں کے حکمرانوں کی حمایت بھی ان عناصر کو حاصل رہی۔ افغان جنگ کے وسائل کی صورت میں مختلف تنظیموں کے جانبازوں کی تربیت بھی یہاں ہونے لگی۔ بے شمار نئی مذہبی، متشدد تنظیمیں باقاعدہ طور پر وجود میں آ گئیں۔ جن کا پہلے نام و نشان بھی

اس ملک میں نہ تھا۔ یہ تنظیمیں اسلامی جہاد اور افغانستان کے نام پر ابھریں لیکن رفتہ رفتہ فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر گئیں۔ کوئی اہل حدیث سے منسلک تھی۔ کوئی دیو بندی۔ کوئی جماعت اسلامی کی ہم نوا تو کوئی شیعہ فرقے کے خلاف اور کوئی اہل سنت کی دشمن۔ اس اثنا میں ایک اور صورت بھی سیاسی سطح پر نمودار ہوئی۔ یہ صورت جنرل ضیاء الحق کے دور میں کراچی اور سندھ میں لسانی اور نسلی گروہوں میں بڑھتا ہوا نفاق اور نفرت تھی۔ ضیا الحق کی حکومت نے اپنے اغراض و مقاصد کے لیے جان بوجھ کر اسے ہوا دی تاکہ وہ عناصر طاقت ور اور مضبوط ہو کر پیپلز پارٹی کے خلاف محاذ آرائی کی صورت پیدا کر سکیں۔ اس طرح ایک طرف تو ''مہاجر قومی موومنٹ'' کا فوجی باز و مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا دوسری طرف جارحانہ مذہبی تحریکیں وجود میں آنے لگیں۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ سیاسی سطح پر ۱۹۴۷ء سے پہلے طلبا کی دو تنظیمیں سرگرم عمل تھیں۔ ایک آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن اور دوسری آل انڈیا سٹوڈنٹس کانگرس۔ اس کے جواب میں مسلم لیگ کی حمایت میں علی گڑھ میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی گئی۔ ان کا کام سیاسی سطح پر کانگرس اور مسلم لیگ کے نظریات کو فروغ دینا اور انتخابات میں ان کی مدد کرنا تھا۔ یہ سلسلہ آزادی کے دور تک جاری رہا۔ آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں جماعت نے اسلامی جمعیت طلبا کا آغاز کیا۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی کے جواب میں عوامی لیگ نے بھی اپنے حامی طلبا کی تنظیم کا اجراء کیا۔ رفتہ رفتہ یہ دونوں تنظیمیں بازوؤں میں تشدد کا رنگ اختیار کرتی گئیں۔ جماعت اسلامی اور عوامی لیگ کو جب بھی تشدد کی ضرورت پیش آتی تھی تو وہ طلبا کی ان تنظیموں کو آگے کر دیتی تھیں۔

اس کے بعد پاکستان میں طلبا کی تنظیمیں بنانے کا رواج عام ہو گیا۔ جماعت اسلامی کے علاوہ پیپلز پارٹی، مسلم لیگ اور پھر شیعہ سنی تحریکوں کے بھی طالب علم ونگ بن گئے۔ اب نیم فوجی تنظیموں کی صورت میں سپاہ محمد اور سپاہ صحابہ کے سٹوڈنٹس ونگ بھی بنے ہوئے ہیں اور ساتھ ہی الگ تنظیمیں بھی وجود میں آ چکی ہیں۔ جیسا کہ پاسبان اور طالبان وغیرہ۔

ان مذہبی اور نیم فوجی تنظیموں کے وجود میں آنے کے بعد پاکستان کا سیاسی افق جس طرح خون آلود ہوا ہے اور جس طرح مذہب کے نام پر خون اس ملک میں بہایا گیا

ہے، اس کی مثال افغانستان اور ایران کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔

جنرل ضیاء الحق نے ایک دفعہ کہا تھا کہ سیکولر مزاج کے لوگ دراصل پاکستان میں گھاس میں چھپے ہوئے سانپ ہیں جن کا خاتمہ ضروری ہیں تا کہ اسلام نافذ ہو سکے۔ لیکن اس سرزمین پر جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں فرقہ وارانہ تشدد کے اژدہا نے جو تباہی اور بربادی پھیلائی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔

لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ضیا الحق سے پہلے بھی اس ملک کے اکثر سربراہان مملکت نے مذہبی رہنماؤں کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ سوائے چند رہنماؤں کے جن کو قائداعظم کی سیاسی تربیت کسی حد تک حاصل تھی۔ باقی تمام رہنماؤں نے اپنے اپنے رنگ میں، چاہے وہ ۱۹۵۶ء کا آئین تھا یا ۱۹۶۲ء کا یا ۱۹۷۳ء کا آئین یا پھر ۱۹۷۳ء کے آئین کی دوسری ترمیم اور پھر آٹھویں ترمیم۔ سب کے سب اسی رجحان کے حامل تھے۔ لیکن ان اقدام سے قوم کو کون سے مادی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی فوائد حاصل ہوئے؟ یہ ہم سب جانتے ہیں۔

اس ملک میں امن اور اطمینان کی فضا پیدا ہونے کے بجائے اضطراب، تشدد اور جارحیت میں بے پناہ اضافہ ہی ہوا۔ آج تفرقہ، مذہبی منافرت اور آپس میں جنگ و جدال کی کیفیت دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اب تو یہ حالت ہوگئی ہے آئے دن کوئی نہ کوئی معروف شہری ملک کے ہر بڑے شہر میں قتل ہوتا ہے۔ مساجد میں دن دیہاڑے نمازیوں کو گولیوں سے بھونا جاتا ہے۔ کراچی کا مسئلہ اور امن و امان کی ابتر حالت اسی شہر کا حصہ نہیں اب یہ صورت حال پاکستان کے ہر بڑے شہر میں نمودار ہورہی۔ کراچی کے مسئلے کو آپ لسانی یا نسلی رنگ شاید دے سکتے ہیں۔ لیکن ملک کے دوسرے حصوں اور شہروں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض نسلی یا مذہبی تشدد نہیں۔ اس کے پیچھے سیاسی اور اخلاقی زوال کی بھیانک صورت ہے۔ ادھر ضیا الحق نے اس روایت کو بھی بہت مضبوط کیا کہ آئین اور قانون کے ساتھ جو چاہو کیا جا سکتا ہے۔

آئینی اور قانونی تشدد کی مثالیں:

۱۔ سب سے پہلے تو ضیا الحق نے آئین کی ایک شق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نام

نہاد ''ریفرنڈم'' کرایا اور اپنی حکومت میں پانچ سال کا ازخود اضافہ کر لیا۔ یہ آئینی تشدد کی ایک بدنما مثال تھی۔

۲۔ پھر ۱۹۸۴ء میں ایک ایسے آرڈیننس کا اجرا کیا جس میں اقلیتوں کے بنیادی انسانی حقوق کو تلف کیا گیا۔ اس آرڈیننس کے تحت فوجداری میں 298-B اور پھر 298-C کا اضافہ کیا گیا جس سے توہین رسالت پر تین سال قید بامشقت سے لے کر پھانسی کی سزا تک دی جاسکتی ہے۔

۳۔ آٹھویں ترمیم کی شکل میں مارشل لا کے تمام ان قوانین کو آئینی حفاظت میسر آ گئی جن کے نفاذ سے جنرل ضیاء الحق نے اپنے سیاسی ہاتھ مضبوط کیے تھے۔ اس کے علاوہ آئندہ کے لیے صدر مملکت کے اختیارات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اس میں ایک ایسی شق بھی رکھ دی گئی جس کے تحت صدر مملکت جب چاہے وزیراعظم اور قومی اسمبلی کو معطل کر سکتا ہے۔ اس کو آئین کی 58-II.B کی شکل میں شامل کیا گیا۔ اس کی وجہ سے آئین میں صدر کے ہاتھ میں ''سیاسی تشدد'' کا ایک ایسا ہتھیار آ گیا جس کے ناجائز استعمال سے وہ کسی بھی منتخب حکومت کو جب چاہے ختم کر سکتا ہے۔

کراچی کا مسئلہ

پاکستان میں تشدد کی کہانی اس مسئلے کا ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ کراچی کا مسئلہ صرف ایک شہر کا مسئلہ نہیں، یہ ایک ایسی سیاسی گتھی ہے جسے سلجھائے بغیر ہماری قومی نجات ممکن نہیں۔ اس کا حل ڈھونڈنے کے لیے پوری قوم کو اپنی تمام شعوری اور لاشعوری صلاحیتوں اور قویٰ کو بروئے کار لانا پڑے گا۔ کراچی کا مسئلہ محض لسانی، نسلی یا اقتصادی نہیں، اس کے پیچھے بہت دور رس عوامل کام کر رہے ہیں۔ اس میں پاکستانی قوم کے تہذیبی اور تمدنی مسائل بھی پوشیدہ ہیں اور سیاسی مسئلے بھی پائیدار سطح پر حل چاہتے ہیں۔ یہ شہری آبادی کا مسئلہ بھی ہے اور قومی اخلاق و اقدار کے لیے بھی چیلنج ہے۔ یہ ایک ''شہری ریاست'' کا مسئلہ نہیں یا یونان کی افلاطونی شہری ریاست کا نصب العین نہیں، یہ کسی حد تک علم کے شہر اور علم کے دروازے کا بھی نہایت اہم پہلو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس لیے اس مسئلہ کا تذکرہ اور تجزیہ ہماری قومی ضرورت ہے۔

کراچی کے مسائل میں شہر کے حجم سے لے کر اس کی مجموعی نفسیات اور اجتماعی شعور اور شہریت تک کے مسائل شامل ہیں۔ ۱۷۲۹ء میں اس کراچی شہر کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس کے نزدیک موجودہ بندرگاہ سے چھ سات میل دور ایک چھوٹی سی مچھیروں کی بندرگاہ تھی جس کا نام ''کھڑک بندر'' تھا۔ اس کی آبادی دو تین ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ چند سال بعد ۱۷۳۲ء کے لگ بھگ موجودہ کراچی کی کیماڑی بندرگاہ کو بھی استعمال میں لایا گیا۔ اسکے پاس بولٹن مارکیٹ کے پیچھے ایک قلعہ نما بستی آباد تھی جس کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ لیاری ندی سے اس بستی میں میٹھا پانی مہیا کیا جاتا تھا۔ اس رخ پر قلعے کے دروازے کو ''میٹھا در'' کہا جاتا تھا اور جو دروازہ سمندر کے سامنے کھلتا تھا اس کو ''کھارادر'' کا نام دیا گیا۔ ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے اس شہر کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ یعنی ۱۸۵۷ سے صرف ۱۸ سال پہلے یہ علاقہ ایک تجارتی بندرگاہ کے طور پر انگریزوں کے تسلط میں آیا۔ یہی اس کی اہمیت کا نقطہ آغاز تھا۔ ہندوستان کی ''سونے کی چڑیا'' کے بال و پر نوچ کر یہیں سے باہر دساور کو بھیجے جاتے تھے۔ اس علاقے کی تمام فصلوں کے ذخیرے خام مال کی صورت میں، گندم ہو کہ کپاس، نمک ہو کہ خام گڑ اور شکر سب انگلستان بھیجے جاتے تھے اور وہاں سے تیار مال کی صورت میں پھر درآمد کیے جاتے تھے۔ ''اقتصادی تشدد'' کی نئی روایتوں اور کھلی منڈی کی نئی اقتصادیات کا یہاں سے آغاز ہو رہا تھا۔

۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے اس شہر پر قبضہ کرنے کے بعد اس قلعہ نما بستی کے باہر نیپئر بیرکس اور سول لائنیز میں اپنے دفاتر اور چھاؤنی قائم کی۔ جدید کراچی کی یہ ابتدا تھی۔ پہلے کوئی میونسپل نظام نہیں تھا۔ پہلے Conservancy Board بنا اور پھر ''میونسپلٹی'' کی ابتدا ہوئی۔ اس دور میں کراچی ایک صاف ستھرا شہر بن گیا اور ہندوستان کے خوبصورت ترین شہروں میں شمار ہونے لگا۔

تقسیم ہند کے وقت کراچی کی آبادی پونے دو لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس آبادی میں مقامی سندھی آبادی کی بہت کم شرح تھی۔ البتہ گجراتی، مارواڑی، بلوچی اور اس طرح مرہٹہ اور ہندو تجارت پیشہ لوگ اس شہر میں کثرت سے آباد تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کراچی چونکہ پاکستان کا دارالحکومت بنا اور وہ سمندری بندرگاہ بھی تھا اور فضائی راستہ پر بھی تھا، اس لیے ہندوستان سے انتقال آبادی کا مرکز بن گیا۔ خصوصاً ان لوگوں کی توجہ اس پہ زیادہ مرکوز

ہوئی جن کا خاندانی تعلق کسی نہ کسی طرح ملازمت پیشہ لوگوں سے تھا۔ چاہے وہ تجارت کے حلقوں سے وابستہ تھے یا حکومتی اداروں سے منسلک تھے۔ ان کے اہل و عیال اور رشتہ دار جن میں ظاہر ہے یوپی اور سی پی کے لوگ زیادہ تھے، کثرت کے ساتھ کراچی میں ہجرت کر کے آنے لگے۔ یہ لوگ کراچی میں بہتر معاش، بہتر شہریت اور وطنیت کے حصول کے لیے آ رہے تھے۔ ان میں اکثر وہ لوگ تھے جن کے رشتہ دار سرحد کے دونوں طرف تھے۔ یعنی ہندوستان میں بھی۔ یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ آج ۱۹۹۷ء میں بھی ایک محتاط اندازے کے مطابق پاک و ہند میں نوے لاکھ ایسے خاندان موجود ہیں جن کے عزیز و اقارب سرحد کے دونوں جانب موجود ہیں۔ ۹۰ لاکھ خاندانوں کا مطلب ہوا کہ تقریباً پانچ سے چھ کروڑ افراد کم از کم ان خاندانوں سے وابستہ پاکستان اور ہندوستان میں اس وقت موجود ہیں، جن کی ''تقدیریں'' ان دونوں ملکوں کی تقدیروں سے نازک سطح پر وابستہ ہیں۔

قائداعظم کے اصرار کے باوجود جب کراچی کے ہندو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وہاں سے چلے گئے تو اس خلا کو پر کرنے کے لیے کراچی میں رہنے والے مسلمان عناصر نے دہلی، یوپی اور سی پی والوں کو دعوت عام دی کہ وہ کراچی آئیں۔ اس کے بعد ایک ایسا رجحان غالب آیا جس کے تحت کراچی کی آبادی میں ہر سال دو سے تین لاکھ افراد کا اضافہ ہونے لگا اور اگلے ۱۵ سال سے ۲۰ سال تک کراچی دو لاکھ کی آبادی سے بڑھ کر ستر اسی لاکھ تک پہنچ گئی اور اب آبادی ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک کروڑ سے اوپر جا چکی ہے۔ کراچی کی آبادی کا اندازہ لگانا موجودہ صورت میں صحیح طور پر ممکن نہیں کیونکہ مردم شماری ہماری سیاست کا نازک سوال بن گئی ہے۔ اس کی وجہ سے قومی سطح پر بھی مردم شماری ناممکن ہوگئی ہے۔ کراچی سے سیاسی مسائل وابستہ ہیں اس لیے آبادی کی مردم شماری انصاف کے اصولوں پر کروانا بھی کراچی کا ایک بہت اہم مسئلہ ہے، جس کا حل تلاش کرنا ضروری ہے۔

بہرحال گردش ایام کی طرف اگر ذرا پیچھے لوٹ کر نظر دوڑائی جائے تو قائداعظم نے یہ اعلان کیا کہ پاکستان کی قومی زبان ''اردو'' ہی ہوگی تو پاکستان کی اس آبادی کو اطمینان اور سکون ملا جو پاکستان کی تہذیب اور اس کے تمدن کے مستقبل کے خدوخال مغلیہ تہذیب سے اٹھانا چاہتے تھے۔ یہ ایک ایسا تاثر تھا جس نے کراچی کی آبادی کے رہن سہن کو اردو تہذیب سے روشناس کرانا شروع کیا۔ ظاہر ہے یوپی، سی پی، بہار اور اڑیسہ تک کے

رہنے والے کھاتے پیتے لوگوں میں یہ جذبہ تھا کہ وہ نئے اسلامی ملک میں اپنی قسمت آزمائیں۔ کراچی سے بہتر اور کون سا شہر ان کی نظر انتخاب میں آ سکتا تھا۔ شروع شروع میں کراچی میں بھی متروکہ جائیداد اتنی تھی کہ کمشنر کراچی کو اس کی الاٹمنٹ کی پرچیاں بانٹنا اتنا مشکل کام نہیں تھا۔ لیکن ان کی دیکھا دیکھی جتنے لوگ ہندوستان سے منتقل ہو کر آنے لگے ان کے لیے خاطر خواہ انتظام اگلے سالوں میں کرنا دن بدن حکومتی اداروں کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اس طرح آہستہ آہستہ کچی آبادیوں کی صورت میں خلق خدا آباد ہونے لگی۔ اور ''خدا کی بستیاں'' کراچی میں افراط سے بسائی جانے لگیں، اور ان میں رہنے والے لوگوں کے معاشی اور معاشرتی حالات دن بدن دگرگوں ہوتے چلے گئے۔

اس شہری دباؤ اور تناؤ کے ماحول میں کراچی کے سیاسی حالات نے بھی سرعت کے ساتھ رنگ بدلا۔ کراچی شہر پر دباؤ اور تناؤ کا تشدد جسمانی بھی تھا اور مادی بھی تھا۔ اس طرح یہ تشدد اعصابی بھی تھا اور سیاسی بھی۔ یہ صورت اس وقت زیادہ کھل کر سامنے آنے لگی جب سیاسی ہنگاموں اور جلسے جلوسوں سے خوف کھا کر اور یہ بھانپ کر کہ کس طرح ملک غلام محمد اور جنرل سکندر مرزا کراچی میں چند جلوس نکلوا کر حکومتوں کا تختہ الٹ دینے میں کامیاب ہوتے تھے، صدر ایوب نے یہ چال چلی کہ کراچی کو ایک تجارتی مرکز ہی رہنے دیا جائے اور دارالحکومت پاکستان کے مرکزی علاقے میں منتقل کیا جائے۔ کراچی سے دارالحکومت کا انتقال ایک ایسا سیاسی سانحہ تھا جس کے دور رس نتائج مرتب ہوئے۔ اس انخلا کے سلسلے میں پہلی مرتبہ کراچی کی آبادی کے ایک مقتدر حصے نے، جس میں یوپی اور بنگال عناصر شامل تھے، محسوس کیا کہ ہماری مرکزی حیثیت کو ہم سے چھین کر ہمیں صوبائی سطح پر سندھیوں اور مقامی لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑا جا رہا ہے۔ یہ وہ احساس تھا جس نے آبادی کے تمام طبقوں کو بری طرح اثر انداز کیا۔ چاہے وہ سندھی بولنے والے تھے یا اردو بولنے والے۔ چاہے وہ کراچی میں رہتے تھے یا حیدرآباد اور خیرپور یا میرپور خاص یا سکھر میں۔ اس عدم تحفظ کے احساس نے شہری آبادی کو جذباتی سطح پر اثر انداز کرنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ مہاجروں اور مقامی لوگوں میں مخاصمت کی فضا پیدا ہونے لگی۔

کراچی میں یہ فضا صرف مہاجروں اور سندھیوں کے درمیان پیدا نہیں ہوئی بلکہ سب سے پہلے مہاجروں اور پٹھانوں کے درمیان منافرت کے آثار ظاہر ہوئے۔ پٹھان قوم

کی کثیر آبادی، سرحد اور افغانستان کے ملحقہ علاقوں سے تجارتی مال و اسباب کے آنے جانے کی وجہ سے کراچی میں آباد ہوتی جا رہی تھی۔ رسل و رسائل اور سڑک کے راستے سے تجارت کا تمام کاروبار پٹھانوں کے ہاتھوں میں ہی تھا۔ ٹرکوں اور ٹرالوں سے تجارت کی مہارت انہیں حاصل تھی۔ اس لیے یہ لوگ کراچی میں کچی آبادیوں میں بہ آسانی بستے جا رہے تھے۔ ویسے بھی پٹھانوں کا عموماً اور خاص کر قبائلی علاقوں میں آبادیاں کچے گھروندوں کی شکل میں ہی ہوتی ہیں اس لیے اس طرح کی آبادیاں بسانے میں انہیں خاص مہارت حاصل تھی۔ اس طرح ان کچی آبادیوں میں ہندوستان سے آئے ہوئے لوگ یا پھر یہ پٹھان ہی آباد تھے۔ صدر ایوب کے دور سے ہی ان دونوں طبقوں میں لسانی اور نسلی تشدد کے واقعات خاصی نازک صورت حال پیدا کر چکے تھے۔ کراچی سے مرکزی دارالحکومت کی منتقلی کے بعد پٹھانوں کا زور تو کچھ کم ہو گیا لیکن سندھی اور کراچی کے مہاجروں میں پیچیدگیاں دن بدن بڑھنے لگیں۔

یوپی سے آئے ہوئے مہاجروں کو مقامی باشندوں پر کئی لحاظ سے سبقت بھی حاصل تھی۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ قومی زبان ان کے گھر کی لونڈی تھی اور پاکستانی کلچر کے بہرحال وہ علم بردار تھے ہی۔ یوپی اور وسطی ہندوستان سے آئے ہوئے مسلمان تقریباً ۷۰ سے ۸۰ فیصد پڑھے لکھے تھے۔ ادھر ۶۹۔۱۹۵۸ء تک نو یونٹ سکیم کی وجہ سے مرکزی حکومت کا اختیار صوبائی حکومتوں سے کہیں زیادہ تھا۔ اس لیے اس دور میں کراچی کی حکمران آبادی اور ان کے لواحقین کا دائرہ اختیار اور اثر و رسوخ بہت وسیع تھا۔ پھر ایوب خاں کی اقتصادی پالیسی کی ترجیحات بھی کچھ ایسی تھیں کہ امریکی امداد سے لائے گئے کارخانوں کی تعداد تعداد کراچی میں ہی واقع تھی۔ مواصلاتی نظام کے اخراجات سے بچنے کے لیے کراچی میں کارخانوں کے قیام کو مقامی اور بیرونی سرمایہ کار زیادہ منافع بخش سمجھتے تھے اور زیادہ محفوظ اور آسان بھی۔ ان کے ساتھ وابستہ کاروباری دفاتر اور دیگر تجارتی ادارے بھی بہت تیزی اور وسعت کے ساتھ کراچی میں ہی کھلنے لگے۔ ان میں ملازمین کی کھپت میں مہاجرین کا حصہ ظاہر ہے قابلیت اور اہلیت کے اعتبار سے مقامی باشندوں سے کہیں زیادہ ہونا لازمی امر تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر کراچی میں مہاجرین کا اثر و رسوخ بڑھتا گیا اور اس آبادی کی اکثریت اور وقعت نمایاں ہونے لگی۔ اس آبادی کو اردو بولنے والے لوگ بھی کہا جاتا تھا۔

پھر آہستہ آہستہ ان کے لیے ہتک آمیز نام بھی استعمال ہونے لگے۔ کبھی انہیں ''مکڑ'' کے نام سے کیا جاتا اور کبھی انہیں ''تلیر'' کہا جاتا۔ مراد یہ تھا کہ یہ فصلی پرندے اور بٹیرے ہیں جو کہ فائدہ حاصل کرنے کے لیے وقتی طور پر ہجرت کر کے آ گئے ہیں۔ ان کا جذبہ وطنیت محض فوائد کے حصول سے وابستہ ہے۔ اس سرزمین سے نہ انہیں لگاؤ ہے اور نہ ہی وفاداری اور قربانی کا احساس۔ یہ سب محض تہمتیں تھیں جن کا اختراع جذباتی نفرت اور حقارت کی وجہ سے تھا۔ ان میں سچائی کا عنصر کہاں تک تھا اس سے کسی کو سروکار نہیں تھا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو شروع میں تو محض حب الوطنی کے جذبے سے آئے تھے لیکن بعد میں آنے والے نئی نسلوں اور پودوں کے لوگ جو کہ ۱۹۷۰ء کے بعد آنے شروع ہوئے، ان کی وجہ اپنے رشتہ داروں اور مشرقی پاکستان کی طرف لوٹ جانے والے بنگالیوں کے انخلا کے باعث تھی۔ لوگ جب بنگلہ دیش چلے گئے تو ملازمتوں کے لیے نئے مواقع پیدا ہوئے۔ اس کے نتیجے میں لوگ ہندوستان سے پھر ایک نئے جذبے اور ولولے کے ساتھ آنے لگے لیکن وہ اس بات سے شناسا نہیں تھے کہ ۱۹۷۰ء میں بھٹو صاحب کی پالیسی کے باعث سندھیوں میں تحریک شروع ہو چکی تھی جس کے اثرات مہاجرین کے لیے صحت مند نہیں ہو سکتے تھے۔ جب اوپر والی ملازمتوں میں غیر سندھی عنصر زیادہ محسوس کیا جاتا تھا تو صوبائی حکومت سندھ میں ایسے اقدام کرتی جس سے ان ملازمتوں پر سندی مقامی لوگوں کو زیادہ مواقع مل سکیں۔

ان وجوہات کی بنا پر سندھی آبادی اور مہاجر آبادی میں سخت تناؤ اور اعصابی جنگ کی سی کیفیت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ یہ وہی جذباتی آویزش تھی جو کہ بنگالی اور پنجاب اور پھر مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان پیدا ہوئی تھی۔ ۱۹۷۱ء میں جب بنگلہ دیش معرض وجود میں آ گیا تو سندھ کی آبادی نے اپنے مقبول وزیراعظم کے سائے تلے ایک انگڑائی لی۔ صوبائی حکومت نے مقایم سندھیوں کو ہر لحاظ سے برتری دلانے کا منصوبہ بنایا۔ پہلا قدم تو ملازمتوں میں بری شہرت رکھنے والے رشوت خور لوگوں سے خلاصی پانے کا منصوبہ تھا۔ ہزاروں کی اس فہرست میں سارے صوبہ سندھ سے ۹۵ فیصد مہاجروں کو سرکاری ملازمتوں سے یک دم فارغ کر دیا گیا۔ سندھ کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں اکثر مہاجر اس چھانٹی سے بری طرح متاثر ہوئے۔ ان کی جگہ برق رفتاری سے مقامی سندھی لوگوں کو بھرتی کر لیا گیا۔ پیپلز پارٹی نے سندھ کے بارے میں اپنے پارٹی منشور میں کچھ

وعدے کیے تھے۔ ان وعدوں میں جی ایم سید کے ووٹ بینک کو توڑنے کے مقاصد پوشیدہ تھے۔ اس میں سندھی زبان کو صوبائی زبان بنانے کا مسئلہ بھی تھا جسے صوبائی سطح پر رائج کیا گیا۔ اس سے بھی صوبائی تعصب کو اردو بولنے والوں کے خلاف استعمال کیا گیا۔

اس طریقہ کار سے سندھ میں عموماً اور کراچی اور حیدرآباد میں خصوصاً فسادات نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ ایک اندازے کے مطابق کراچی، حیدرآباد، خیرپور اور نواب شاہ ان چاروں شہروں میں سینکڑوں لوگ قتل کیے گئے اور اسی حساب سے دکانوں اور مکانوں کو نذر آتش کیا گیا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ زخمی ہوئے۔

ادھر مہاجروں اور افغان اور پٹھان آبادی میں سہراب گوٹھ اور لیاری جیسے علاقوں اور پھر اورنگی ٹاؤن کے علاقوں میں مقیم آبادیوں میں فسادات پھوٹ پڑے۔ ان علاقوں میں مہاجر بھی تھے، پٹھان بھی تھے، سندھی بھی تھے اور بنگالی بھی اور پنجابی آبادی کا عنصر بھی موجود تھا۔ یہاں فسادات برپا ہو جانے سے ساری کراچی کی فضا لسانی اور نسلی اعتبار سے بہت ہی مکدر اور مخدوش ہوگئی۔ یہ ملا جلا مختلف زبانوں اور نسلوں کا ملغوبہ اقتصادی زبوں حالی کی موجودہ صورت میں اور بھی زیادہ خوفناک اور ہولناک صورت اختیار کر گیا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ۱۹۷۷ء کے بعد کراچی میں نسلی اور لسانی اعتبار سے اور بھی خطرناک صورت پیدا ہوگئی۔ اس اثنا میں جنرل ضیا الحق نے افغان جنگ کے سلسلے میں اسلحہ اور ہیروئن کے کاروبار کو ایک رنگ میں نیم سرکاری شکل عطا کر دی۔ اگلے چند سالوں میں اس کاروبار میں ملوث اداروں کو ان آبادیوں میں ایک خاص تعصب کی فضا میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس صورت حال کے نتیجے میں ۱۹۸۶ء میں نومبر اور دسمبر میں کراچی اور حیدرآباد میں جو نسلی فسادات ہوئے وہ بہت ہی سنگین نوعیت کے تھے۔ ان میں باقاعدہ دہشت گردی اور ایک حد تک خانہ جنگی کی سی صورت حال تھی۔ بات یہاں سے شروع ہوئی کہ بعض خارجی حلقوں سے شکایات موصول ہوئیں کہ سہراب گوٹھ میں ایک ناجائز اسلحہ کی فیکٹری بڑی سطح پر کام کر رہی ہے۔ جنرل ضیا الحق کی حکومت کو بادل ناخواستہ اس فیکٹری پر چھاپا مارنا پڑا۔ چھاپہ کافی حد تک ناکامیاب ہی رہا کہ متعلقہ افراد نے اس فیکٹری کے مالکان کو پہلے سے اطلاع کر دی تھی۔ بہرحال گولی چلی۔ ایک دوسرے پر فائر ہوئے۔ اس کے فوراً بعد پٹھان مالکوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ غیر ملکی اداروں کو اس فیکٹری کے محل وقوع

کے بارے میں قومی مہاجر موومنٹ کے لوگوں نے اپنا اثر و رسوخ بڑھانے اور اپناالو سیدھا کرنے کے لیے اطلاعات فراہم کی تھیں۔ اس کے نتیجے میں افغان اور پٹھان عناصر کچھ دن بعد ایک منظم انداز میں مہاجر آباد پر اچانک حملہ آور ہو گئے۔ سہراب گوٹھ کے ملحقہ علاقوں یعنی علی گڑھ کالونی اور دوسری بستیوں میں بے دردی سے مہاجروں کو قتل کیا گیا۔ اس واقعہ کو ''علی گڑھ کالونی کا قتل عام'' قرار دیا جاتا ہے۔ یہ واقعات ۱۹۸۶ء میں ہوئے اور انہی واقعات سے ایم کیو ایم کو عروج حاصل ہوا۔ مہاجر آبادی نے جوابی کارروائی کر کے علی گڑھ کالونی میں نہ صرف پٹھان اور افغان آبادی کا بالکل خاتمہ کر دیا بلکہ آس پاس کی آبادیوں میں بھی سخت مار دھاڑ کی۔

اس طرح یہ فسادات کراچی سے نکل کر دوسرے شہروں میں آگ کی طرح پھیل گئے۔ ۱۹۸۶ء کے فسادات میں ہزاروں لوگ زخمی ہوئے اور مارے گئے۔ ان فسادات سے سندھ میں لسانی اور نسلی تعصب نے ایسی ہولناک صورت اختیار کر لی کہ اس کے سدباب کے لیے کسی بھی حکومت کے لیے بھی یہ ممکن نہیں رہا کہ معمول کے اقدام سے کوئی موثر نتائج پیدا کر سکے۔

۱۹۹۰ء میں پیپلز سٹوڈنٹ اور آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹ آرگنائزیشن کے درمیان کراچی اور حیدرآباد میں تصادم ہوئے۔ ہر قسم کا جدید اسلحہ ان فسادات میں استعمال کیا گیا۔ سینکڑوں افراد مارے گئے۔ ان میں طالبعلم بھی تھے اور دوسرے شہری بھی تھے۔ جن کو نسلی امتیاز کے باعث چن چن کر مارا گیا۔ اس وجہ سے اس وقت کی وزیراعظم بے نظیر بھٹو اپنے صوبائی وزیراعلیٰ کو ان کے عہدے سے سبکدوش کرنے پر مجبور ہو گئیں اور وہاں کے آئی جی پولیس کو بھی معطل کر دیا گیا۔ لیکن ان طالبعلم تنظیموں کے لیڈروں کے خلاف کوئی موثر کارروائی نہیں کی گئی۔

پھر مئی ۱۹۹۰ء میں حیدرآباد میں وہ روح فرسا سانحہ رونما ہوا جس میں حیدرآباد کے مصروف ترین بازار میں مہاجروں کا کھلے بندوق قتل عام کیا گیا۔ یہ کراچی کے فسادات کا شاخسانہ تھے۔ یہ فسادات اتنی سنگین نوعیت کے تھے کہ اس وقت کی حکومت کو مجبوراً ان دونوں شہروں کو عارضی طور پر فوج کے حوالے کرنا پڑا اور اس طرح کراچی کے حالات کے پیش نظر ایک دفعہ پھر فوج اور نوکر شاہی کا تسلط عوام کو قبول کرنا پڑا۔ یہ وہ ورثہ تھا اور ہے جو پاکستان

کے سیاست دانوں کو انگریزی نو آبادیاتی نظام سے براہ راست ملا ہے۔ ہمارے ہاں جمہوری اقدار کو چونکہ مقدس اور معتبر جانا ہی نہیں جاتا اس لیے ان سے لاپرواہی برتنا یا بوقت ضرورت ان سے برضا و رغبت آسانی کے ساتھ انحراف کرنا کوئی اتنا مشکل کام نہیں سمجھا جاتا۔ نو آبادیاتی نظام میں فوج اور نوکر شاہی معروضی حالات کے پیش نظر اپنی سمجھ بوجھ اور جذباتی لاتعلقی کی وجہ سے عموماً مارشل لا وغیرہ کے نفاذ کے فیصلے جلد کر لیتی ہیں۔ ان فیصلوں میں حکمرانوں کے ذاتی مفادات کا کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن آزادی کے بعد ہمارے ہاں خصوصاً پاکستان میں فوج بلانا یا مارشل لا کا نفاذ سیاست دانوں اور فوجی لیڈروں کے صوابدید پر ہوتا ہے لیکن یہ محض معروضی حالات کے مطابق نہیں ہوتا۔ اس میں مقایم پسند اور ناپسند، ذاتی مفادات، فائدے اور نقصان، پارٹی کے لیے اچھے برے نتائج سب شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح فوج بلانے کے فیصلے معروضی اور غیر جذباتی سطح پر نہیں ہوتے۔ ہمارے ملک کے حکمران ان فیصلوں کے لیے مناسب طور پر تربیت یافتہ اور تجربات کار نہیں ہیں اس لیے مرکز اور صوبائی سطح پر جب بھی فوج بلانے یا مرشل لا لگانے یا سول حکومت کو برطرف کرنے کے فیصلے صادر کیے جاتے ہیں تو عوام کی نظر میں وہ اکثر مشکوک ہی سمجھے جاتے ہیں۔ اکثر اس قسم کے فیصلے عدل و انصاف کی کسوٹی پر پورے بھی نہیں اترتے ان میں ذاتی مفادات اور تعصبات کی ملاوٹ ضرور ہوتی ہے۔ ملک غلام محمد سے لے کر جنرل ضیاالحق تک اور اس کے بعد غلام اسحاق خاں سے لے کر فاروق احمد لغاری تک مارشل لا کا نفاذ ہو کہ 58-BII کی آئینی شق کا اطلاق، جب بھی سول حکومت کو یا جمہوری منتخب حکومت کو برطرف کیا گیا ہے شک و شبہ کی فضا کا پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ اس لیے پاکستان میں سیاسی نقطہ نظر کے تحت تبدیلی کے لیے جو اقدام کیے جاتے ہیں ان پر عوام کی طرف سے زیادہ اعتماد کا اظہار نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اقدام کا معیار اتنا اچھا یا موزوں ہوتا ہے۔ چنانچہ عوام جلد ہی ان اقدامات سے بددل ہو جاتے ہیں۔

برطرفیاں.........! آئینی تشدد کے مظاہرے!

ملک میں پچھلے دس سال سے مسلسل سیاسی بحران کی صورت جاری ہے۔ آٹھویں ترمیم کی کرم فرمائیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ 58-BII کے تحت تین وزیراعظم پچھلے ۹

سال کے عرصہ میں چار دفعہ برطرف کر دیئے گئے۔ اقتصادی بدحالی، رشوت ستانی، نااہلی اور ناسمجھی اور عیاشی کے الزامات کم وبیش ہر وزیراعظم کے لیے استعمال کیے گئے۔ یہ چاروں وزیراعظم کسی نہ کسی طرح عوام نے منتخب کیے تھے۔عوام کی اکثریت نے ان پر اعتماد کسی حد تک ظاہر ضرور کیا تھا لیکن وزیراعظم اور صدارتی اختیارات کے باہم تصادم کی صورت میں یہ آئینی تشدد بروئے کار لانا پڑا۔ چنانچہ ایک تعطل کی المناک صورت ہر دفعہ پیدا ہوئی۔ ۱۹۸۷ء میں وزیراعظم جونیجو کے ساتھ جو کچھ ہوا اسی قسم کا سلوک وزیراعظم بے نظیر اور نواز شریف کے ساتھ ہوا اور پھر تیسری بار صدر فاروق لغاری نے استعمال کیا اور وزیراعظم کو برطرف کر دیا۔

موجودہ سنگین صورت حال

پچھلے ابواب میں مختلف عنوانات کے تحت انفرادی اور اجتماعی سطح پر تشدد کے حوالوں سے پاکستان میں لسانی، نسلی، مذہبی اور سیاسی اختلاف کی بنیاد پر تشدد کی تاریخ قارئین کے سامنے پیش کرنے کی حتی المقدور کوشش کی گئی ہے۔ ملک کے مختلف خطوں اور طبقوں میں تشدد کا رجحان جس طرح ہماری عمرانی اور تمدنی زندگی میں سنگین صورت حال اختیار کر رہا ہے وہ ہمیں اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر نہ صرف ٹھنڈے دل اور تحمل کے جذبے سے غور وفکر کریں بلکہ اپنی معاشی، سیاسی اور تہذیبی زندگی میں ایسی تبدیلیاں لانے کی بھی کوشش کریں کہ تشدد کے اس رجحان پر قابو پایا جا سکے اور ہم امن، محبت اور اطمینان سے اپنی قومی زندگی کو ''تخلیق'' اور تعمیر کے راستوں پر گامزن کر سکیں۔

اس بات میں یہ کوشش کی جائے گی کہ بحیثیت مجموعی ہم اپنے سامنے ایک ایسا تناظر رکھ سکیں جس سے ہم موجودہ سنگین صورت حال کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کس طرح انفرادی تشدد اور جرائم کی روز افزوں خوفناک شرح کے ساتھ عورتوں اور بچوں پر تشدد کی شرح میں بھی بے حد اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہمارے معاشرے میں لسانی، نسلی اور طبقاتی عصبیت کے ساتھ سیاسی تشدد بھی بھیانک صورت اختیار کر رہا ہے۔ جلسے جلوس محض شکوہ اور شکایات اور نعرہ بازی اور تقریر سازی سے ہٹ کر توڑ پھوڑ مار دھاڑ اور بھیانک دہشت گردی کی صورت اختیار کر رہے ہیں۔ تشدد ایک مہلک ہتھیار کی صورت مذہبی اور سیاسی حلقوں نے بے جھجک استعمال کرنا شروع کر رکھا ہے اور اب قومی سطح پر ایسے آثار وقرائن ظاہر ہو رہے ہیں کہ اس کو ایسی شکل دے دی جائے گی کہ یہ خونی انقلاب کا روپ دھار کر باقی ماندہ قوم اور وطن کا شیرازہ بکھیر دے کیونکہ خون کے سیلاب میں ہر چیز

بہہ جانے کا اندیشہ ہے۔ ہر سیاسی تنظیم اور مذہبی گروہ فی الحال اسے سکہ رائج الوقت کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ لیکن وہ دن دور نہیں جب تشدد کو ایک قہر اور عذاب کی صورت میں اس ملک پر نازل کر دیا جائے گا۔ اس لیے اس بات میں ان عوامل کی نشاندہی کرنا مقصود ہے جن سے تشدد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور ہماری اخلاقی اور تمدنی اقدار زوال پذیر ہو رہی ہیں۔ ہم کردار اور اعمال کی سطح پر ''مفلوج'' اور ''مبہوت'' ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے دو بنیادی وجوہات تھیں جو ایک دوسرے کے ساتھ نہ صرف منسلک تھیں بلکہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بھی تھیں۔ ۱۹۴۷ء سے نصف صدی پہلے انگریزوں کی محکومی کے آخری دور میں ہندوستان کی ہندو اکثریت کو رفتہ رفتہ مغربی جمہوری اصولوں کی بنیاد پر جو اختیارات اور مراعات حاصل ہو رہی تھیں ان کا ایک دردناک اور اذیت ناک پہلو مسلم اقلیت کی کمتری تھا۔ مسلم اقلیت انگریزوں کے تسلط سے پہلے تقریباً چار پانچ صدیوں سے ہندوستان کے اکثر علاقوں میں حکمران تھی اور خاص طور پر مغلیہ سلطنت میں جو جاہ و جلال اور عظمت و حشمت مسلمانوں نے ہندوستان میں دیکھی اور محسوس کی تھی اس کا نشہ مسلمان اقلیت کے دل و دماغ میں اس قدر سرایت کر چکا تھا کہ اس کے نقوش کو بے اثر کرنا مغربی جمہوریت کے اصول و قواعد کے لیے ناممکن تھا۔ علمی اور سیاسی لحاظ سے مسلمان کسی صورت ایسی فضا کے لیے تیار نہ تھے جس میں ہندو اکثریت ان پر اپنا اقتدار مسلط کر سکے اور وہ صبر کے ساتھ اس کی حکمرانی قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ شعوری اور جذباتی سطح پر ہندوستان میں بسنے والی سابقہ حکمران مسلمان قوم کے لیے ناممکن امر تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سر سید احمد خاں اور ان کے ساتھ دیگر مسلمان اکابرین نے مختلف نوعیت کی علمی، تمدنی اور سیاسی مساعی کا اس لیے آغاز کیا کہ اس زبوں حالی، احساس کمتری اور کسی حد تک احساس ناکامی کو دور کیا جائے اور ایک نئی سطح پر جدوجہد کا آغاز کیا جائے تاکہ انگریز حاکم کو محسوس ہو کہ مسلم قوم کے بغیر ہندوستان کے معاشرتی اور سیاسی مسائل کا حل اور اس ملک کے انتظامی اور حکومتی نظام کو کسی بھی خاطر خواہ صورت میں چلانا ممکن نہیں۔ اس بنیادی جدوجہد کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں یہ شعور پیدا ہوا کہ بدلتے ہوئے نظام اور حالات میں ان کو بھی از سر نو تعلیم و تربیت کی نئی اقدار سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا پڑے گا۔ اس

سے ذہنوں کی کشادگی پیدا ہوئی اور مسلمانوں کی نئی نسل ایک تازہ ولولے کے ساتھ سرسید احمد خاں جیسے لوگوں کی قیادت میں آگے بڑھی۔

اس عرصے میں بعض عناصر نے یہ کوشش بھی کی کہ ہندو مسلم اتحاد پیدا کر کے ہندوستان کو ایک اکائی اور علاقائی وحدت کے طور پر مغربی جمہوری نظام سے روشناس کرنے کی سعی کی جائے۔ اس سلسلہ میں کئی ایک شعوری کاوشیں ہوئیں۔ مہاتما گاندھی جیسے ہوشیار سیاسی رہنما نے خلافت تحریک کے دوران ایسا رویہ اپنایا کہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جیسے مقتدر لیڈروں کو یہ احساس پیدا ہو گیا کہ شاید ہندو مسلم اتحاد کا خواب پورا ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ لیکن حالات نے ثابت کر دیا کہ گروہی مفادات اور طبقاتی عصبیت کو کسی صورت چھوڑا نہیں جا سکتا۔ مسلمانوں کے بیدار مغز رہنما محمد علی جناح نے بخوبی بھانپ لیا کہ ہندو مسلم اتحاد کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اس وقت ایک سوچے سمجھے حکیمانہ انداز میں قائداعظم کے مغربی جمہوری اصولوں کے تحت مسلمانوں کے بنیادی جمہوری حقوق پر زور دینا شروع کیا اور پھر مسلم قوم کے لیے الگ سیاسی ڈھانچے کے خد و خال کو ابھارنے کا کام نہایت فرض شناسی اور حکمت سے سرانجام دیا۔ آہستہ آہستہ انگریزی مدبرین کو بھی یہ احساس ہونے لگا کہ برصغیر ہندوستان میں ایک سیاسی وحدت کے اصولوں پر جمہوری نظام تشکیل دینا ناممکنات میں سے ہے۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۶ء تک ہندو مسلم فسادات میں جو بنگال، بہار، اڑیسہ اور ہندوستان کے دوسرے دور دراز علاقوں میں مسلسل بپا ہو رہے تھے، انگریز حکمرانوں کو یہ ماننے پر مجبور کر دیا کہ ہندوستان کی سیاسی تقسیم لازمی امر ہے۔

اس دوران قائداعظم نے اپنے مدبرانہ سیاسی شعور اور حکمت عملی کے ساتھ آئینی اعتبار سے ایسے حل پیش کیے جو نہ صرف مغربی جمہوری نظام کی رو سے قابل عمل تھے بلکہ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے سب سے زیادہ موثر اور حقیقت کے نزدیک بھی تھے۔ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کے بعد صرف سات سال کے قلیل عرصہ میں مسلمانوں کو ایک سیاسی معجزے کی صورت میں برق رفتاری سے آناً فاناً آزادی اور خود مختاری دونوں حاصل ہوئیں۔

دو صدی کی محکومی کے بعد مغربی جمہوریت کے اصولوں کی بنا پر اقتدار کی منتقلی کے لیے مسلمان بحیثیت قوم ہندوستان میں عموماً اور موجودہ پاکستان کے خطوں میں خصوصاً ذہنی

اور جذباتی سطح پر حکومتی نظام سنبھالنے کے لیے کسی صورت بھی تیار نہیں تھے۔ نہ ماضی قریب میں ان کی تربیت اس رنگ میں ہوئی تھی اور نہ ہی مغلیہ خاندان کے دور میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے علاقوں میں ایسا ہوا تھا۔ پانچ ہزاری اور سات ہزاری جاگیردارانہ فیوڈل نظام کے جاگیرداروں اور گورنروں کی حکومت کے مطلق العنان طریقوں کے سوا اس علاقے میں نظم ونسق چلانے کا کوئی اور انداز مسلم شعور اور نفسیات میں داخل ہی نہیں ہوا تھا۔ انگریزوں کا مسلط کردہ انتظامی نظام انگریزوں کے اپنے مقاصد کے لیے کارآمد تھا کیونکہ اس کی بنیاد انگریز حاکم پر تھی جس کا اس علاقے سے کوئی ذہنی، جذباتی یا اخلاقی رشتہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ معروضی سطح پر فیصلے کرنے کے قابل ہوتا تھا۔ ہمارا اپنا نظام فیوڈل تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ سو اس کا نتیجہ آزادی کے بعد یہی نکلا کہ حکمران طبقے میں ایک شدید سیاسی بحران پیدا ہوا۔ مغربی سیاسی نظام ہمارے لیے محض دکھاوے کی چیز تھا۔ چنانچہ جب اگست ۱۹۴۷ء میں ہمیں نہ تھے اور پھر مسائل کی اتنی بھرمار ہوئی کہ ہم نے ہر کام اپنی صوابدید پر بغیر قانونی اور جمہوری جواز کے نبٹانے شروع کر دیئے پھر مہاجرین کے قافلوں نے ہمارے بنیادی انتظامی ڈھانچے کو مکمل طور پر مسمار کر دیا۔

یہ تمام عوامل ایک ایسی افراتفری کا باعث بنے کہ ہم ہر لحاظ سے ذہنی، جذباتی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی تشدد کا شکار ہونے لگے۔ ۱۹۴۷ء کے اوائل میں ہمیں بے شک بے انتہا قربانیوں کی توفیق بھی ملی۔ ہم نے تقسیم ہند کی دہلیز پر عظیم مالی اور جانی قربانی پیش کی لیکن ان معاملات سے جو مسائل ہمارے سامنے آئے ان کے روز مرہ کے حل تلاش کرتے ہوئے ہم معار اخلاقی اصولوں اور جمہوری نظریات کو بالکل نظر انداز کرنے کے عادی ہو گئے۔ ہم نے لاشعوری سطح پر اپنے لیے یہ لازم قرار دے لیا کہ وقتی حل کے لیے اخلاقی اقدار اور معیار کو قربان کر دینا نہ صرف ضروری ہوتا ہے بلکہ اس میں ہی فوائد مضمر ہیں۔ اگر قانون اور امن کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ''تشدد'' کی کئی صورتیں جائز بھی ہیں اور فرض بھی تو پھر وقت کی فوری ضرورت کے لیے وقتی طور پر قانون شکنی یا قانون سے لاپرواہی اور استغنا کیوں جائز نہیں۔ اس لیے نہ صرف وقتی ضرورت کے تحت قوانین اور آئین کو پس پشت ڈالا جا سکتا ہے بلکہ ان کے ساتھ تشدد بھی کیا جا سکتا ہے۔

اس ذہنی اور جذباتی رویے کے تحت قومی سطح پر تین بنیادی کردار ابھر کر سامنے

آئے۔ اول یہ کہ قومی اور انفرادی فائدے کے لیے قانون اور آئین کو نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں بلکہ ضروری ہے۔ دوسرا یہ کہ اسی نقطہ نظر کے تحت ہم ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۶ء تک آئین سازی سے غفلت برتتے رہے۔ آئین سازی سے لاپرواہی کی صورت میں ہم ہیں بے لگام رہنے کی عادت راسخ ہوتی گئی۔ تیسرا رویہ یہ تھا کہ قومی اور انفرادی سطح پر قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی روایت ڈال دی گئی۔ تقسیم ہند کے سنگم پر قتل و غارت اور انسانی زندگی کی ارزانی دیکھ کر حیات انسانی سے بے دریغ کھیلنے کا احساس بھی کسی قدر ہم میں پیدا ہو گیا۔ انسانی جان اور انسانی حقوق کی پاسداری کے لیے ضروری جذباتی لگاؤ اور عقیدت ہم میں رفتہ رفتہ مفقود ہو گی۔ یہ ایک ایسا بھیانک پہلو تھا جس کی وجہ سے لاشعوری طور پر ہم میں تشدد کا رجحان تیزی کے ساتھ قومی سطح پر پروان چڑھنے لگا!

ان حالات کے ساتھ ہی ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں ''جہاد کشمیر'' نے بھی کچھ دُور رس نتائج مرتب کیے۔ اس ''جہاد'' کے لیے جانی، مالی اور جذباتی وسائل مہیا کرنے کی شکل میں ہم نے اپنی دوسری قومی ذمہ داریوں سے لاپرواہی برتنے کا ایک طریقہ کار وضع کر لیا۔

اس طرح نہ صرف ہم انفرادی سطح پر قوانین اور آئین کے ساتھ ''تشدد'' کرنے کے عادی ہو گئے بلکہ املاک حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے ناروا سلوک، جعل سازی، جھوٹ، دروغ گوئی اور متشدد رویے کو استعمال کرنا جائز جاننے اور ماننے لگے۔ دوسروں کے حقوق اور ان کی زندگیوں کو ارزاں جاننا اور ان کے حقوق تلف کرنا یہ تقسیم ہند کے فسادات کا شاخسانہ تھے۔ اگر ہندو مسلم فسادات ہو سکتے ہیں اور نفرت کی بنیاد رنگ و نسل اور مذہب کو بنایا جا سکتا ہے تو پھر لسانی اور نسلی سطح پر بنگالی، پنجابی، سندھی اور مہاجر اپنے اپنے مفادات کے لیے دوسروں کے حقوق کیوں پامال نہیں کر سکتے!

ان عوامل کے ساتھ کچھ اور مسائل سے بھی ہم دو چار تھے جن کی طرف ہم نے بالکل دھیان نہیں دیا۔ ان میں تعلیم اور خواندگی کا مسئلہ بھی تھا۔ ہم تقریباً اَن پڑھ قوم تھے۔ آزادی کی دہلیز پر ہماری شرح خواندگی ۲۳ فیصد تھی جو آزادی کے بعد رفتہ رفتہ زوال پذیر ہوتی گئی۔ اس بارے میں بھرپور کوشش ہماری طرف سے قومی سطح پر کبھی ہوئی ہی نہیں خصوصاً تعلیم نسواں کے سلسلہ میں تو ہم نے بے انداز غفلت کا مظاہرہ کیا۔ عورتیں ہمارے معاشرے کا نصف تھیں۔ نصف بہتر نہ سہی لیکن ان کی تعلیم شہروں اور گاؤں میں ہر جگہ زوال

پذیر ہوئی۔ خاص طور پر دیہاتی آبادی میں عورتوں سے محنت مزدوری کا کام لینا تو معمول تھا لیکن خواندگی کی طرف بھی توجہ دی جا سکتی تھی جس کو یکسر نظر انداز کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں نئی نسل بالکل علم سے بے بہرہ رہ گئی۔ بچوں سے محنت مزدوری کا کام لینا اور ان کے بچپن کی بیگار سے اپنی اقتصادی حالت کو بہتر بنانا اور ان کے حقوق کو قربان کرنا نہ ان کی صحت کا خیال رکھنا اور نہ ہی تعلیم اور بنیادی ضروریات کا۔ اس طرح سے ہم بہت حد تک ایک سفاک قوم کی صورت میں اپنے شہروں اور دیہات میں زندگی بسر کرنے کے خوگر ہو گئے۔ عورتوں اور بچوں پر شدید دباؤ اور خوفناک تشدد کی شرح بے انداز بلند ہونا شروع ہو گئی۔

ہیومن رائٹس کمیشن کے ایک مستند تجزیے کے مطابق اس وقت ہمارے ملک میں ڈیڑھ کروڑ سے دو کروڑ تک ۵ سال کی عمر سے لیکر ۱۲ سال کی عمر تک کے بچے جبری مشقت اور محنت مزدوری کرتے ہیں۔ وہ بیچارے روزانہ آٹھ سے دس گھنٹے بہت ہی سستی اجرتوں پر کام کرنے کے لیے مجبور کیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو انہیں دور دراز علاقوں میں مہیب بیگار کیمپوں میں مقید رکھا جاتا ہے اور ان کے پاؤں میں زنجیریں باندھ کر ان سے کام لیا جاتا ہے۔ بچوں کے اغوا کے کثیر واقعات انہی بیگار کیمپوں کے پیٹ بھرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔

جب ہم بحیثیت قوم، اپنی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کے حقوق سے غفلت برتنے کے عادی ہو گئے ہیں، ان کی جائیدادیں اور وراثتیں ہضم کرنا ہمارا پیشہ بن گیا ہے، اور بچوں سے غفلت اور لاپرواہی کا سلوک اور ان کے حقوق تلف کرنا ہماری عادت ہے تو پھر ہم خاندانی سطح سے ابھر کر معاشرتی سطح پر بھی اس قسم کی وارداتیں سرزد کرنے میں کیوں پس و پیش کریں گے!

پاکستان کی تاریخ میں تشدد اور لاپرواہی کے واقعات آپ کو جگہ جگہ نظر آئیں گے۔ ۱۹۵۶ء تک ہم نے اپنا آئین ہی نہیں بنایا تو بے لگام رہنے کی عادت راسخ ہو گئی۔ پھر جب آئین پیریٹی یعنی یکسانیت یا برابری کے اصول پر بنایا تو مشرقی پاکستان کے عوام پر تشدد کی بنیادی استوار کر دی۔ پھر اس آئین کو بھی ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کی صورت میں پامال کر دیا گیا جو تشدد کی ایک بدترین مثال تھی۔ اس کے بعد ملک غلام محمد، سکندر مرزا اور جنرل ایوب اور بعد میں جنرل یحییٰ اور جنرل ضیا نے جس طرح آئینی تشدد کا مظاہرہ کیا وہ

بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔

جنرل ایوب کے دورِ حکومت کے آغاز سے ہی مشرقی پاکستان کے عوام کی نفسیات میں آہستہ آہستہ تبدیلی آنے لگی کیونکہ ہم کالی چمڑی والے بنگالی کو جو بدبودار مچھلی کھانے کا عادی تھا، کسی طور پر اپنا ہمسر ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ چاہے وہ خواجہ ناظم الدین ہوں یا حسین شہید سہروردی یا محمد علی بوگرہ۔ اس بات کا لازمی نتیجہ تھا شیخ مجیب الرحمٰن! تشدد کا جواب تشدد ہی ہو سکتا تھا۔ مجیب الرحمٰن نے طلبا کو تشدد آمیز سیاسی تربیت دے کر اپنی سیاست کی بنیاد رکھی۔ اس طرح پاکستان میں زبان اور نسل کی بنیاد پر تشدد کی سیاست کا آغاز ہوا۔

کراچی کا مسئلہ محض اردو زبان سے نہیں شروع ہوا۔ یہ مسئلہ دراصل کراچی سے فیڈرل کیپیٹل کو منتقل کرنے سے پیدا ہوا۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے مہاجر اور سندھی میں شدید کشمکش شروع ہوئی جو لسانی اور نسلی تشدد کی شکل میں تبدیل ہوتی گئی۔ پھر بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی نے اپنے صوبائی منشور میں اس مسئلہ کو ہوا دی۔ ۱۹۷۱ء کے لسانی اور نسلی فسادات اس مسئلہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ قومی مہاجر موومنٹ کے لیے تمام وسائل جنرل ضیاء الحق کی سفاکانہ سیاست نے مہیا کیے۔ رہی سہی کسر افغانستان کی جنگ نے ''اسلحے اور ہیروئن'' کی آسان دستیابی کے ساتھ پوری کر دی۔ یہ دونوں مافیے اس مسئلے سے منسلک ہوتے گئے اور معاملہ خطرناک صورت اختیار کرتا گیا۔

اس سے پہلے مشرقی پاکستان کے المیے کی صورت میں رنگ و نسل کی بنیاد پر قتل و غارت اور جنگ کی وجہ سے لاکھوں جانوں کا نقصان ہوا۔ اس پس منظر میں ''قومی مہاجر موومنٹ'' کے عزائم بھی واضح تھے۔ ''بندوق کی نالی سے سیاست وابستہ ہوتی ہے'' یہ مغرب اور مشرق دونوں کے آزمائے ہوئے نسخے ہیں۔

پھر ہماری قومی زندگی میں ''تشدد'' کا ایک نیا دفتر اس پہلو سے بھی کھل گیا کہ ہم اندھا دھند افغان جنگ اور افغان جدوجہد سے منسلک ہو گئے۔ ہم نے افغانستان سے اپنے مخصوص قدیمی روابط اور باہمی سلوک کی لاشعوری اساس کو یکسر بھلا دیا۔ افغانستان، پاکستان کی قوم سے ۱۹۴۷ء کے آغاز سے کیا سلوک کر رہا تھا ہم اپنے اسلامی جذبے میں ان لاشعوری عوامل کو مکمل طور پر نظر انداز کر گئے۔ ہم نے امریکہ کے ساتھ اور سعودی عرب کی

حمایت سے افغان گروپوں کی ہر طرح مدد کی۔ یہ مسلح جدوجہد افغانستان کی حدود میں شروع ہوئی۔ روس نے آخر پسپائی اختیار کی اور اسی دوران یہ عظیم اشتراکی سلطنت پاش پاش ہو گئی۔ اس کا سہرا بھی افغان جدوجہد اور جنرل ضیاالحق اور جنرل اختر کے سر پر باندھا گیا۔

اس ''جہاد'' کے نتائج پاکستان کے لیے کتنے خوش آئند ہیں یا ہوں گے یہ تو تاریخ ہی بتائے گی۔ لیکن اس کے فوری اثرات یہ مرتب ہوئے کہ گوریلا جنگ کے تمام لوازمات ہمارے ہاں آسانی سے میسر آنے لگے۔ جس سے ہمارے مذہبی عناصر کو جدید اسلحے سے شناسائی اور اس کی تربیت کا تجربہ حاصل ہو گیا۔ مجاہد گروپ بننے لگے۔ فرقہ وارانہ تنظیموں کے فوجی بازو وجود میں آنے لگے۔ سپاہ صحابہ اور سپاہ محمد اور احوان، پاسبان اور طالبان قسم کی تنظیمیں فوجی لحاظ سے مضبوط تر ہو گئیں۔ تشدد کے واقعات ملک کے کونے کونے میں فرقہ وارانہ شکل میں رونما ہونے لگے۔

موجودہ صورت حال اس لیے زیادہ خطرناک ہے کہ جہاں مذہبی عقائد کا سوال پیدا ہوتا ہے وہاں ہر کوئی بظاہر یہ سمجھتا ہے کہ وہ حفظ ماتقدم کے طور پر خود کو مسلح کر رہا ہے لیکن اس عمل میں جارحیت کا ارتکاب کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے اور مدافعت کے رنگ میں جارحیت اکثر کی جاتی ہے۔ اسے بزعم خود اپنے عقائد کی رو سے اخلاقی اور مذہبی سطح پر جائز قرار دیا جاتا ہے۔ یہ وہ رویہ ہے جو پاکستان عام میں ہو رہا ہے۔ ہم نظریات کی جنگ میں ہی نہیں الجھتے جا رہے ہیں بلکہ ان کے دفاع کے لیے ''تشدد'' کو ہر رنگ میں جائز سمجھنے لگے ہیں۔ نظریات کے تحفظ کے لیے دوسروں کا خون بہانا لازمی امر سمجھا جاتا ہے۔ یہ مرتد کا قتل ہو یا کافر سے جنگ۔ جو امر باعث حیرت ہے وہ یہ ہے کہ ''تشدد'' کی سیاست اور تشدد کے مذہبی پیروکار وہ لوگ ہیں جو پڑھے لکھے ہیں۔ اپنے اپنے رنگ میں عالم کہلاتے ہیں۔ مغربی تعلیم ہو یا مشرقی بہرحال تعلیم کی اقدار سے روشناس ہیں۔ یہی لوگ تشدد کی فضا پیدا کر رہے ہیں ان میں مذہبی سکالر بھی ہیں۔ ڈاکٹر بھی ہیں اور انجینئرز بھی۔ دوسری طرف ملک کا وہ طبقہ ہے جو بالکل ان پڑھ ہے اور جو زیادہ تر دیہات میں رہنے والا ہے۔ ان کو ہم جاہل قرار دیتے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ ان کے ہاں سیاسی اور اجتماعی تشدد کا رجحان بہت کم پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے روابط میں امن پسند ہیں ایک دوسرے سے حلم اور شفقت اور رکھ رکھاؤ کا سلوک روا رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس شہری آبادی میں تشدد کا رجحان تیزی سے

بڑھ رہا ہے۔ تشدد کے یہ سب کاروبار تعلیم یافتہ حلقوں میں بڑے بڑے شہروں میں انجام پا رہے ہیں۔

اس وقت مہلک ترین جدید ہتھیار آپ جب چاہیں، جہاں چاہیں خرید سکتے ہیں۔ طیارہ شکن توپیں، کلاشنکوف، بارودی سرنگیں یا کوئی اور قسم کے مہلک ہتھیار سب ''کھلی منڈی'' میں دستیاب ہیں۔ ایسا اسلحہ بیچنے والوں کی تعداد سوا لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے جن کا کاروبار اور تجارت ہی یہی ہے۔

عام ڈاکو، چور اور لٹیرا بھی ان کا خریدار ہے اور سیاست دان، ملا اور وڈیرا بھی ان سے تجارت کرتا ہے۔ یہ ان کے تجارتی رفیق بھی ہیں اور پھر ان ''مافیوں'' میں شریک بھی ہیں۔

اب تشدد کا بالکل دوسرا رخ دیکھیے جو ملک میں ایک نظام کی صورت میں رائج ہے۔ پاکستان کے چاروں صوبوں اور قبائلی علاقوں اور شمالی علاقہ جات میں قانون نافذ کرنے والے ادارے مثلاً پولیس چوکیاں، تھانے اور دیگر حفاظتی نیم فوجی دفاتر کی تعداد پاکستان کے کل دیہات، قصبوں اور شہروں کی تعداد کی روشنی میں تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب بنتی ہے۔ انفرادی تشدد اور جرائم کے واقعات ان پولیس تھانوں اور چوکیوں میں رپورٹ ہوتے ہیں۔ یہ واقعات قتل سے لے کر چھوٹی موٹی مار پیٹ، اغوا اور چوریوں تک کے ہوتے ہیں۔ ان ایک لاکھ بیس ہزار پولیس چوکیوں میں اگر سارے سال میں ۳۰ واقعات کی شرح ہر ایک پولیس یونٹ یا چوکی کی ہو۔ یعنی ہر مہینے تقریباً تین واقعات کی شرح تو پھر ان تمام جرائد یا تشدد کے واقعات کی تعداد تقریباً ۳۱ لاکھ کے قریب بنتی ہے۔

اب دوسری طرف ذرا یہ بھی غور کیجیے کہ ان پولیس چوکیوں اور تھانوں میں بہت سے واقعات بالکل درج ہی نہیں کرائے جاتے۔ لوگ محض خوف اور زحمت اٹھانے کے ڈر سے پولیس تھانوں کا رخ نہیں کرتے۔ اگر اس قسم کے واقعات ۳۱ لاکھ کے قریب ہوں تو تشدد کی شرح سالانہ کیا بنے گی۔ پولیس تھانوں اور چوکیوں میں ان تشدد کی ایف آئی آر کے سلسلہ میں جو تشدد روا رکھا جاتا ہے اس کو بھی آپ شمار کریں تو ہر سال ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک کروڑ انسان اس تیرہ کروڑ کی آبادی میں کسی نہ کسی طرح تشدد کا شکار ہوتے ہیں۔ کئی خاندان، کئی قبیلے اس سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ تشدد کے سدباب کے لیے تشدد کا

استعمال ہماری پولیس کا پرانا شیوہ اور وطیرہ ہے لیکن اب پولیس مقابلوں میں جو تشدد روا رکھا جا رہا ہے وہ ایک نیا بھیانک رخ ہے۔ پولیس مقابلوں میں مارے جانے والوں کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچی ہے اور اب تو وزیراعظم کا بھائی بھی اس کا شکار ہو چکا ہے۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ تشدد کرنے والا اور جس پر تشدد کیا جاتا ہے دونوں ہی ایک ایسے غیر معمولی جذباتی ہیجان اور تشویش سے گزرتے ہیں جن سے ان کی ذہنی اورجسمانی نشوونما اور پرورش بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیے تشدد کے عمل سے جو بھی دو چار ہوتا ہے وہ تشدد کرنے والا ہو یا تشدد سہنے والا اس کی نفسیات ایک حد تک بیمار اور لاچار ضرور ہوتی ہے۔ اسکی انسانی توانائی بہت حد تک متاثر ہوتی ہے۔ وہ معاشرے میں فعال انداز سے شریک نہیں ہوسکتا۔اس کی شرکت تخلیقی اور تعمیری سطح پر دن بدن کمزور ہوتی جاتی ہے۔''متشدد'' معاشرہ مضبوط اور توانا نہیں رہ سکتا۔ وہ بیمار اور کمزور ہوتا جاتا ہے۔ ہم امن و امان قائم کرنے والے اداروں کی طرف سے جو کچھ رونما ہوتا دیکھ رہے ہیں ہماری قومی زندگی کے لیے بہت نقصان دہ اور مضر ثابت ہوگا اور ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں جناب عزیز صدیقی کا مضمون جو''جہد حق''میں چھپا ہے اس کا ایک اقتباس آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے:

''وزیر داخلہ نے حراست میں لیے گئے افراد کے بارے میں ہیومن رائٹس کمیشن کی تشویش پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ وزیر موصوف نے کمیشن سے سوال کیا کہ کیا انسانی حقوق انسانی زندگی سے زیادہ اہم ہوتے ہیں؟''

''اس سوال کا جواب آسان ہے اس لیے کہ بات ایک دوسرے سے کم یا زیادہ اہمیت کی نہیں ہے۔ دونوں ہی مساوی اہمیت رکھتے ہیں۔ انسانی زندگی خود ایک انسانی حق ہے۔ لیکن ساتھ ہی انسانی آزادی بھی انسانی حق ہے اور ہر فرد کا اذیت سے تحفظ بھی اس کا حق ہے۔ ہمارا استدلال یہ تھا اور یہ رہے گا کہ کسی انسانی زندگی کے زیادہ پر تاسف صحیح، لیکن اس کا مطلب دوسروں کو ان کے زندہ رہنے کے حق اور ان کی آزادی سے محروم کرنا نہیں ہونا چاہئے۔ نہ ہی اس کا مطلب یہ ہونا چاہئے کہ ہم کسی جرم کی کھوج میں دوسروں کے ساتھ ظالمانہ اور غیر انسانی یا توہین آمیز سلوک کو جائز تصور کر لیں۔ چلیے ایک لمحہ کو ہم جنرل بابر کو اس بات کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ اگر ترازو کے ایک پلڑے میں دہشت گرد کے حقوق تھے تو

دوسرے پلڑے میں اس کا نشانہ بننے والوں کے حقوق تھے۔ سوال یہ ہے کہ توپوں کے دہانے کھولنے سے پہلے کیا متعلقہ ایجنسی نے اس بات کا یقین کر لیا ہوتا ہے کہ جن افراد کو اس نے نشانہ بنایا ہے واقعتاً وہی دہشت گرد تھے جن کی تلاش تھی۔ کیا اس بات کے اس کے پاس معقول شواہد موجود تھے؟ جن لوگوں کے پاس جبر کرنے کا اختیار ہوتا ہے ان پر اس کے استعمال میں احتیاط کی ذمہ داری بھی دو چند ہوتی ہے۔ امن و امان کی ذمہ دار ایسی ایجنسیاں جو معمولی شبہ اور حتمی یقین میں تمیز نہیں کر سکتیں ان کا کسی مہذب معاشرے میں کوئی مقام نہیں ہوتا۔ خوف و ہراس، اذیت رسانی اور جوابی دہشت گردی امن و امان قائم کرنے میں کبھی معاون ثابت نہیں ہوتے۔ چند سو افراد کو حراست میں لینے اور ان میں سے پچاس ساٹھ کو اذیت کا نشانہ بنانے اور پھر چند ایک کو ''مقابلوں'' میں ہلاک کرنے کے بعد ایک دہشت گرد تو شاید کم ہو جائے گا لیکن دوسری طرف کتنے ہی وردیوں والے وحشیانہ سلوک میں اور پختہ ہو جائیں گے اور ڈیڑھ دو سو افراد وہ ہوں گے جنہیں بے جا طور پر اذیت کا نشانہ بنایا گیا ہو گا۔ یعنی ان کے عزیز و اقارب اور دوست اور واقف کار، ہمیشہ کے لیے ناراضگی اور تلخی کا شکار ہو جائیں گے اور ڈیڑھ دو سو افراد وہ ہوں گے جنہیں بے جا طور پر اذیتکا نشانہ بنایا گیا ہو گا۔ یعنی ان کے عزیز و اقارب اور دوست اور واقف کار، ہمیشہ کے لیے ناراضگی اور تلخی کا شکار ہو جائیں گے اور بیشتر مجرم تو پھر بھی دندناتے ہی پھریں گے۔ جنرل بابر صاحب، ذرا غور تو کریں وہ کس حق کی اور کس کے حق کی بات کر رہے ہیں۔''

(جہد حق۔ نومبر ۱۹۹۶ء)

حقیقت بھی یہی ہے کہ امن و امان قائم کرنے والے ہزاروں اور لاکھوں چھوٹے بڑے اداروں کی طرف سے سارے ملک میں جس خوفناک اور خطرناک طور پر سنگین تشدد کی شرح میں اضافہ ہوا ہے اس سے معاشرے کی زوال پذیر صورت حال کا ہی اشارہ ملتا ہے۔ جو تشدد کر رہے ہیں اور جن پر تشدد ہو رہا ہے، دونوں کی نفسیات ملک کے لیے تباہ کن ہے۔ ۱۴ کروڑ کی آبادی میں ان کی شرح الم ناک حد تک بہت زیادہ ہے۔ اس مطالعے کے مطابق تو ہر سال ہماری آبادی کے تقریباً ایک کروڑ افراد، جن میں عورتیں، بچے اور مرد سب شامل ہوتے ہیں، شدید تشدد کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ تشدد جنسی بھی ہو سکتا ہے، جسمانی بھی اور جذباتی اور روحانی بھی۔ ہر طرح کے تشدد سے ہمارا معاشرہ دو چار ہے۔ اس میں ہر

طرح کی اذیت اور ہر طرح کا اسلحہ اور وسائل استعمال ہو رہے ہیں۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے تربیت یافتہ ہزاروں افراد خود ہر طرح کے تشدد کی طرف برضا و رغبت مائل نظر آتے ہیں۔ ان کی بندوقوں کے دہانے بحالت مجبوری یا سوچ بچار کے بعد نہیں کھولے جاتے بلکہ ان میں جذبات کی وارفتگی اور وحشت شامل ہوتی ہے۔ ''تشدد'' کا عنصر ان کی دوسری فطرت بن گیا ہے اور اس سلسلے میں ارباب اختیار کی بے حسی بھی تشویش شناک ہے۔ مکافات عمل کی صورت اب وزیراعظم پاکستان کے بھائی کا قتل ہے۔ الزامات کی بارش ایک دوسرے پر برسائی جا رہی ہے۔ معتبر ترین اداروں کو بخشا نہیں گیا اور تو اس واقعے کے ردعمل کے طور پر اور دوسرے الزامات کے باعث وزیراعظم کے ان کے عہدے سے برطرفی عمل میں آ چکی ہے۔ ''تشدد'' کی یہ فضا اور کیا گل کھلائے گی؟ کیا اب بھی ہم اسلحے کے کاروبار اور ان کھلی منڈیوں کا کوئی سدباب نہیں کریں گے؟ پھر ہم کس کا احتساب کر رہے ہیں؟ امن و امان اور سکون صرف نوٹوں کی برآمدگی اور ''زرمبادلہ'' کی واپسی سے تو نہیں لوٹ آئے گا۔

اور ابھی تو پاکستان کی آبادی بغیر مردم شماری کے تیرہ کروڑ گنوائی جاتی ہے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد یہ سب اندازے محض قیاس آرائیاں پر مبنی ہیں۔ پاکستان کی آبادی میں اندازاً چالیس لاکھ افراد کا سالانہ اضافہ ہو رہا ہے۔ ہیومن رائٹس کمیشن کے اندازے کے مطابق اس میں ۴۱ فیصد آبادی کی عمر ۱۵ برس سے کم ہے۔ اس ۴۱ فیصد آبادی میں جو کہ بچوں اور نونہالوں کی ہے، ان میں دو تہائی ان پڑھ رکھے جا رہے ہیں اور ان کی نصف آبادی جبری مشقت اور محنت مزدوری کی چکی میں پیسی جا رہی ہے تاکہ ان کے بڑوں کو دو وقت کا کھانا نصیب ہو سکے۔ ۱۹۵۰ء میں کراچی میں دس لاکھ افراد کی آبادی تھی اور اب یہ بڑھ کر ایک کروڑ سے اوپر جا چکی ہے۔ آبادی کے ''تشدد'' کے باعث، جو کراچی شہر پر روا رکھا گیا ہے، کراچی میں تشدد کی فضا قائم ہوئی ہے، اس میں پچھلے ۳۰ سال میں لاکھوں افراد لقمہ اجل بن چکے ہیں یا تشدد کی زد میں آ کر بری طرح زخمی ہو چکے ہیں۔ لاہور اور دوسرے بڑے شہروں کا حال بھی کچھ اچھا نہیں ہے۔

یہ معاملات سنجیدہ غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ مادی وسائل کی وسعت دراصل پیداواری وسائل کی وسعت سے ہی ہو سکتی ہے اور یہ ہماری تخلیقی توانائی کو بروئے کار لانے

کی دعوت دیتی ہے لیکن ہم تو دن بدن ہتھیاروں سے لیس ہو کر مرنے مارنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ مذہبی بنیاد پرست تنظیمیں دوسری سیاسی جماعتوں کو ذہنی طور پر یہی اختیار کرنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ مذہبی اعتبار سے بھی، سیاسی اعتبار سے بھی اور ''طبقاتی کشمکش کی سوچ'' کے اعتبار سے بھی ہمارے خود ساختہ قومی تقاضے کہیں ہمیں بظاہر ''انتشار'' کی طرف تو نہیں لے جا رہے ہیں۔ اس عبوری دور کے بعد ہماری سمت کیا ہو گی؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ابھی ہمیں اپنی سمت کا صحیح احساس ہوا ہی نہیں تھا کہ خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ یاد رکھنا چاہئے کہ قوموں کا احتساب بھی ہوتا ہے اور مکافات عمل ایک محکم قدرتی اور طبعی اصول ہے جسے کسی صورت ٹالا نہیں جا سکتا!!

مستقبل کی امیدیں اور اندیشے

اس باب میں ہم قارئین کے سامنے عالمی پس منظر کے حوالے سے عموماً اور پاکستان کے سلسلے میں خصوصاً کچھ ایسی باتیں پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے اس امر کا اندازہ ہو سکے کہ مستقبل میں بحیثیت قوم ہمارے سامنے کیا امید افضا پہلو یا امکانات ہیں اور کن خدشات یا اندیشوں سے ہم دو چار ہو سکتے ہیں۔ تشدد عالمی پس منظر میں دنیا کے مختلف حصوں میں نہ صرف نظریاتی تضادات کی وجہ سے بلکہ لسانی، قومی اور نسلی امتیازات کے باعث بھی فروغ پاتا دکھائی دے رہا ہے۔ کرہ ارض ایک عجیب تضاد کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ خاص طور پر یہ بات حیران کن انداز میں عیاں نظر آتی ہے کہ دنیا کے وہ علاقے جنہیں ہم اس جدید دور میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ، مہذب اور متمدن قرار دیتے ہیں اور معاشرتی اور معاشی لحاظ سے بھی انہیں دوسرے علاقوں کی نسبت کہیں زیادہ تعلیم یافتہ، آسودہ اور متمول سمجھتے ہیں۔ مثلاً، امریکہ، یورپ اور روس وغیرہ.......... وہاں پچھلے ستر اسی سال سے تشدد کی ایک ایسی لہر اٹھی ہے کہ وہاں ہر طرح کے نسلی، لسانی اور نظریاتی تشدد کی تحریکیں اپنا سر اٹھا رہی ہیں اور اپنا بھیانک رنگ دکھا رہی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظیم کے بعد تک کی تاریخ کو دیکھئے اور پھر انہی علاقوں میں دوسری جنگ عظیم کے بعد کا دور ہم سب کے سامنے ہے۔ نظریاتی سرد جنگ اور اس کی معاشی اور معاشرتی رسہ کشی اور کھینچا تانی روس اور امریکہ کے درمیان ایک طویل جدوجہد کی داستان ہے جس میں ہر قسم کا تشدد روس یک طرف سے مشرقی یورپ پر روا رکھا گیا اور مغربی ملکوں، خاص طور سے امریکہ کی طرف سے ایشیا اور افریقہ میں تشدد کی پالیسی اپنائی گئی۔ ۱۹۸۹ء کے بعد روس کے نظام حکومت کی شکست و ریخت اور دیوار برلن کا مسمار ہونا سب اسی سیاسی کشمکش کا نتیجہ ہیں۔ اسی وجہ سے مشرقی یورپ کے کئی ممالک میں نسلی اور لسانی تشدد اپنا روپ دکھا رہا ہے۔ بوسنیا ہو کہ چیچنیا،

آذربائجان ہو کہ دوسری چھوٹی ریاستیں ہر جگہ سیاسی تشدد کسی نہ کسی رنگ میں اثر انداز ہو رہا ہے۔ اسی طرح دوسرے براعظموں میں بھی یہی سلسلہ جاری ہے۔ افریقہ میں روانڈا، برونڈی، صومالیہ، تنزانیہ کی مثالیں موجود ہیں۔ ایشیا میں سری لنکا، برما، لاؤس، جنوبی ہندوستان اور شمالی ہندوستان اور پھر پاکستان اور افغانستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ اسی کشمکش کے آثار چین کے شمال میں بھی نظر آ رہے ہیں۔

اسی طرح اگر آپ ایک اور نقطہ نگاہ سے دیکھیں تو نظریات کی جنگ کے ردعمل کے طور پر خصوصاً امریکہ کی ویت نام میں طویل ناکام جنگ کے بعد ۱۹۶۰ء کی دہائی میں آزاد ندیا میں جنگوں کے خلاف مظاہروں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ ان مظاہروں میں بھی تشدد کو بروئے کار لایا گیا لیکن یہ ایک ایسی جہت کی طرف اشارہ تھا جس میں امید افزا پہلو بھی مضمر تھے۔ شاید جدید انسانیت، نظریات کی بنا پر تشدد کے استعمال سے متنفر نظر آنے لگی تھی۔ اس جذبے کا اظہار نہ صرف امریکہ میں ہوا بلکہ دنیا کی تمام اکناف میں بھی ظہور پذیر ہونے لگا۔ یہ اس رجحان اور فلسفے کا ردعمل تھا جسے ہم مغرب کے انداز فکر کے مطابق انیسویں اور بیسویں صدی کا ''تعقل یا استدلال کا دور'' (Age of Reason) کہتے ہیں۔ اس دور میں جدید سائنس، فلسفہ، معاشیات اور نفسیات کے دور رس نظریات کا شدت سے اظہار ہوا، اور انسانی فکر پر ان کا غلبہ ہوا، خواہ وہ سائنس کے طبیعیاتی یا مابعد الطبیعیاتی نظریات تھے، یا ارتقا کا نظریہ جو ڈارون نے پیش کیا، جدلیاتی فلسفہ تھا جو مارکس کی دریافت قرار پایا، یا جدید نفسیات کے میدان میں تحلیل نفسی والوں کے محیر العقول نظریات تھے۔ ان سب کے زیر اثر انسانی ذہن کی جو ''تسخیر'' اور ''تعمیر'' ہوئی اس کا جائزہ پیش کرنا ہمارا مقصود نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ان علوم کی وجہ سے بھی ایک رنگ میں سائنس، فلسفے، معاشیات اور اقتصادیات کے میدانوں میں محاذ آرائی کی کیفیت نے بہت شدت اختیار کی۔ بلکہ کئی خطوں میں تو نظریاتی تصادم نے بھیانک شکل بھی اپنا لی!

''تشدد'' کا رجحان مشرق وسطیٰ میں ایک اور وجہ سے بھی رونما ہوا۔ مغربی میڈیا میں یہ تو کھلے بندوں کہا جاتا ہے کہ اسلامی ممالک میں مذہبی بنیاد پرستی کا فروغ بہت خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے، لیکن مغرب نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے قیام سے فلسطین کو جس طرح دولخت کر کے فلسطینی

عربوں کو ان کے ملک سے نکل جانے پر مجبور کیا گیا، اور جس طرح محض تشدد کے بل بوتے پر یہودی آبادی کو عربوں پر مسلط کیا گیا اس سے عرب ممالک میں ''تشدد'' کا رجحان پیدا ہو جانا ایک لازمی نتیجہ تھا۔ اسی وجہ سے مصر، عراق، شام، لبنان اور اردن اور دیگر عرب ممالک میں ایسی تنظیمیں وجود میں آئیں جو عرب قومیت کے دفاع کے لیے تشدد کے استعمال کو ہر رنگ میں اپنے مفادات کی خاطر مناسب قرار دیتی ہیں۔ یہاں ''تنگ آمد بجنگ آمد'' والا مسئلہ پیدا ہونا لازمی امر تھا۔

جدید دنیا کے موجودہ تمدن اور تہذیب کے حوالے سے ایک اور پہلو بھی ہے جس سے ''تشدد'' کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ بظاہر یہاں قاری کو محض قیاس آرائی کی صورت نظر آئے گی لیکن اس میں کچھ ایسے عمرانی اور نفسیاتی عوامل بھی ہیں جنہیں درگزر نہیں کیا جا سکتا۔ آپ اگر غور سے دیکھیں تو تمام دنیا میں دیہاتی علاقوں سے شہروں کی طرف ایک عظیم نقل مکانی کا عمل جاری ہے۔ تمام دنیا میں لوگ دیہات سے شہروں کی طرف فوج درفوج منتقل ہو رہے ہیں۔ بہتر روزگار کے مواقع کے حصول کی خاطر یہ ہو رہا ہے۔ اس ہجرت میں بھی تشدد کے کئی ایک رموز پوشیدہ ہیں۔ نیم تعلیم یافتہ آبادی اپنے قویٰ کی مضبوطی اور برتری اور زیادہ جسمانی مشقت اور محنت برداشت کرنے کے باعث، شہری آبادی کے مقابلے میں زیادہ تگ و دو اور مزاحمت سے کام لے کر اپنی برتری منوانے کے لیے برسر پیکار ہے۔ اس میں بھی تشدد کا رنگ موجزن ہے۔ دیہات اور شہر کی آویزش سے بھی آبادیوں میں ایک کشمکش اور جارحیت جنم لے رہی ہے۔ یہ اسی طرح کی مخفی جارحیت ہے جس طرح کہ ایشیا اور یورپ کی متمدن اور مہذب اقوام اور ممالک کو آج سے کچھ صدی پہلے نیم تعلیم یافتہ اور نیم وحشی یعنی تاتاری اور چنگیزی اور ہن قوموں نے اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روند ڈالا تھا۔ اسی طرح کی آویزش بعض اوقات زراعت پیشہ علاقوں اور صنعتی علاقوں کے درمیان بھی رونما ہو جاتی ہے۔ ''تنگ دستی'' کے باوجود اگر ایک سطح پر قوموں میں ''تندرستی'' موجود ہو تو مزاحمت کا پہلو نہ صرف غالب آ جاتا ہے بلکہ مدمقابل پر غلبہ بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ تاریخ کا یہی سبق ہے۔ انقلاب اسی طرح آتے رہے ہیں۔

اس مختصر سے عالمی پس منظر میں اب ملک خداداد پاکستان کی بات بھی کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہونی چاہئے۔ اس برصغیر کا جغرافیہ عموماً اور موجودہ پاکستان کا جغرافیائی

تشخص خصوصاً چند غیر معمولی خصوصیات کا حامل ہے۔ پاکستان کا شمالی علاقہ یعنی اس کا سرکوہ ہمالیہ، کوہ قراقرم اور ہندوکش کے پہاڑوں سے مزین ہے۔ بے شک جوالامکھی پہاڑ اور آتش فشاں مادے کہیں اندر کی سطحوں میں پوشیدہ ہوں گے لیکن انسانی لاشعور کی طرح ان کے سر پر برف کی ٹھنڈی یخ ٹوپی پہنا دی گئی ہے۔ جس طرح انسانی دماغ کی حفاظت کے لیے کھوپڑی کافی محفوظ ساخت کی ہوتی ہے اسی طرح ہمارا شمالی علاقہ محفوظ برفانی پہاڑوں کی آغوش میں ہے۔ دماغ کی شریانوں کی طرح سے اس میں سے ہمارے تمام اہم دریا چشموں اور آبشاروں کی صورت میں اوپر سے نیچے کی طرف بہتے ہوئے ہمارے جسم اور اعضا کو سیراب کرتے وادیوں، میدانوں اور صحراؤں سے گزرتے سمندر کی آغوش میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ اس سارے علاقے کی شادابی، اس کی سرسبزی اور زرخیزی انہی دریاؤں کے پانی اور بہاؤ پر انحصار کرتی ہے۔ یہ دریا عموماً نہایت اطمینان اور سست رفتار سے میدانوں سے گزر کر سمندر سے جا ملتے ہیں ان میں آئے دن کا تشدد جغرافیائی سطح پر نمودار نہیں ہوتا۔ لیکن جب کبھی موسمی حالات میں تبدیلی آتی ہے تو یہی دریا بپھر کر ''سیلاب'' کے ''تشدد'' میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کناروں سے باہر اُمڈ پڑتے ہیں۔ یہ قدرتی آفت کا مظہر کبھی ''سیلاب'' اور ''طوفان'' کی صورت اختیار کر جاتا ہے اور کبھی کبھار زلزلوں اور وبائی امراض کی شکل! لیکن اکثر و بیشتر ہمارا ماحول سازگار ہی رہتا ہے۔ تشدد کے وہ روپ ہم اس سرزمین پر عموماً نہیں دیکھتے جو دوسرے علاقوں میں کثرت سے بپا ہوتے رہتے ہیں۔

اسی طرح ہماری اپنی مقامی اور اندرونی تاریخ جسے ہم ''انڈس ویلی'' کی باطنی یا مقامی تاریخ کا نام بھی دے سکتے ہیں بہت پرانی تاریخوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے نقوش ہمیں یہی پتہ دیتے ہیں کہ دریاؤں کے کناروں پر کھیتی باڑی کی تہذیب یہاں بہت قدیم ہے۔ کہیں کہیں یہاں عورت کی حکمرانی کے آثار بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن معاشرتی سطح پر ہماری اندرونی یا باطنی تاریخ میں ''تشدد'' کا فروغ کہیں نظر نہیں آتا۔ جنگی آلات کا ''سراغ'' تو اس وادی میں بہت کم ملتا ہے۔ شکار کے آلات بھی دھات اور لوہے کے زمانے میں اس طرح تیز اور نوک دار نہیں تھے جتنے دنیا کے اور علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ انڈس تہذیب اور تمدن میں ایک ٹھہراؤ، ایک تحمل اور آشتی کی کیفیت جھلکتی نظر آتی ہے۔ یہاں تشدد عموماً درہ خیبر کے پار سے یا پھر مشرق میں سمندر کے راستوں سے درآمد ہوتا

رہا ہے۔ یہاں کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے کہ یہاں کے لوگ خود درہ خیبر پار کر کے یا سمندر عبور کر کے کسی پر حملہ آور ہوئے ہوں۔ اگر یہ روایت کہیں تھوڑی بہت ابھری بھی ہے تو حملہ آوروں کی یلغاروں کی صدیوں کی تاریخ کے بعد جو سندھ کی وادی پر ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اکا دکا ''تشدد'' یا جنگ کی صورت میں ی ہاں کے مقامی باشندوں کی طرف سے ہمیشہ دفاع کی صورت ہی اختیار کی گئی۔ مثلاً ''مہاراجہ پورس'' وغیرہ۔ لیکن اکثر حملہ آور قومیں ہی ایک دوسرے سے نبرد آزما رہیں۔

موجودہ پاکستان کا علاقہ تو خاص طور پر ان قوموں اور قبائل پر مشتمل ہے جن کو قدیمی اور نسلی سطح پر کبھی حکمرانی یا بادشاہت نصیب نہیں ہوئی۔ پنجاب کی وادی میں تو خاص کر سوائے سکھوں کے یہ علاقہ فوج کشی کا نشانہ باہر سے ہی بنتا رہا ہے۔ پنجاب، سندھ اور سرحد کے علاقوں سے حملہ آور گزر کر اکثر دہلی اور آگرے میں براجمان ہو جاتے تھے۔ اسی علاقے میں حملہ آوروں کی تہذیب اور تمدن فروغ پائے۔ مسلمانوں کے عروج کے زمانوں میں غوری، خلجی، تغلق، لودھی، مغل یا پٹھان سب یوپی اور بہار میں حکمرانی کرتے تھے۔ موجودہ پنجاب پر تو پانچ ہزاری، سات ہزاری اور دس ہزاری خلعتوں اور خطابوں سے چند مخصوص لوگوں کو نواز کر اپنا تسلط جما لیا جاتا تھا۔ سکھوں کا ایک صدی سے بھی کم کا زمانہ ایسا ضرور ہے جس میں کسی حد تک اقتدار اندرونی سطح پر یہاں کے لوگوں کا رہا ہے لیکن یہیں سے مذہبی تشدد کی روایت سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان ابتدا کے طور پر رواج پائی۔ اس علاقے میں ہندو ازم اور پھر بدھ ازم کے عروج و زوال کے بعد اسلام ''دعوت'' کے ذریعے قبول کیا گیا۔ یہ دعوت صوفیا اور مشائخ کی مساعی کے نتیجے میں قبول کی گئی۔ کیونکہ یہ انسانی مساوات اور انسانی حقوق کی پاسداری کی دعوت تھی اور انہی اصولوں کی بہت حد تک آئینہ دار تھی۔ دراصل ہندو ازم کی طبقاتی تقسیم، اچھوت، ویش، کھشتری اور برہمن سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسلام کے مذہبی اور عائلی نظام کو ترجیح دی گئی۔ اسی وجہ سے اسلام زیادہ تر ہندوستان کے بازوؤں میں پھیلا اور کناروں پر قبول کیا گیا۔ وسطی ہندوستان کے علاقوں میں اسے زیادہ پذیرائی نہیں ملی، باوجود اس امر کے کہ حکمران زیادہ انہی علاقوں میں اپنی حکومتیں اور دارالخلافے قائم کرتے رہے۔

سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ اس علاقے میں ''تشدد'' کی تاریخ نہ ہونے کے

باوجود پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ میں اس قدر تشدد کیسے رونما ہوا۔ بہرحال ہم نے تاریخی تناظر میں قارئین کے سامنے پاکستان کی موجودہ صورت حال پچھلے ابواب میں پیش کرنے کی ایک ناچیز اور تمام کوشش ضرور کی ہے۔ مقصد صرف یہی تھا کہ ان معروضی حالات کا جائزہ پیش کیا جائے جس سے یہ اندازہ لگانا ممکن ہو سکے کہ پاکستانی قوم بحیثیت مجموعی کس طرف جا رہی ہے۔

ہماری قومی اور نظریاتی تشکیل کہیں اس طرح تو نہیں ہو رہی کہ ہم بحیثیت قوم رفتہ رفتہ ایک متشدد معاشرے میں تبدیل ہونے کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں؟ جس طرح یورپ کا معاشرہ قرون وسطیٰ میں ۹۵۰ء سے ۱۲۵۰ء تک کے عہد میں تشکیل پاتا رہا۔ وہ معاشرہ مذہبی، لسانی اور نسلی تعصب کا بری طرح شکار تھا۔ اسی لیے اس عہد کو عموماً ''تاریک ادوار'' کا نام دیا جاتا رہا ہے۔ (Dark Ages) جو کہ تین چار صدیوں تک محیط رہا۔

اس بات پر بھی ہمارے معاشرے کو غور کرنا ہوگا کہ تشدد ایک ایسا منفی عمل ہے جو عامل اور معمول دونوں کی شکست و ریخت کا باعث ہوتا ہے۔ معاشرے کے تمام عناصر، مرد، عورت اور بچے، خاندان، قبائل اور تمام طبقات اس سے متاثر ہوتے ہیں۔

ابھی یہ سب کچھ اسی وقت ہو رہا ہے جب ہمارے تخمینے کے بموجب اس ملک کی آبادی ۱۳ کروڑ ہی ہے۔ اصل آبادی کس شرح سے بڑھ رہی ہے، اس کا تو ہمیں علم ہی نہیں۔ ۱۹۸۰ء کے بعد مردم شماری ابھی تک ہوئی نہیں۔ اس ۱۳ کروڑ کی آبادی میں مشکل سے ۲۰ فی صد لوگ ''تعلیم یافتہ'' کہلائے جاسکتے ہیں۔ جبکہ ۸۰ فیصد لوگ ہر قسم کی تعلیم و تربیت سے بالکل کورے ہیں اور اس ۸۰ فیصد آبادی کا دو تہائی حصہ عورتوں اور بچوں پر مشتمل ہے۔ جن کی تعلیمی سطح اور بھی مخدوش ہے اور یہ وہ انسانی آبادی کا اہم حصہ ہے جس پر سب سے زیادہ ''تشدد'' کیا جاتا ہے اور جو سب سے زیادہ مظلوم اور مجروح ہے۔

پاکستانی قوم کو اپنی قومی زندگی کے پچاس سال کا محاسبہ اور جائزہ کچھ اس انداز سے کرنا ہوگا کہ یہ احساس ہو سکے کہ آیا بحیثیت قوم ہمارے معاشرے کی تشکیل اس انداز سے تو نہیں ہو رہی کہ ظلم اور تشدد کی فضا میں سانس لینا ہمارا معمول بن جائے اور اس طرح کی طرز زندگی کو ہم قومی سطح پر اپنا لیں اور ہمیں غیر شعوری طور پر اس بات کا احساس تک بھی نہ ہو۔ تاریخ کا سبق تو یہی ہے کہ قومیں جب اپنا شعار ہی ''تشدد'' بنا لیتی ہیں تو تشدد کرنا اور

تشدد برداشت کرنا دونوں منفی عمل کی صورت میں تخریب کا باعث بن جاتے ہیں۔ وہ ہر مسئلہ کا حل طاقت، مار دھاڑ اور تشدد میں ڈھونڈتی ہیں۔ تشدد کا یہ استعمال ان کی دوسری فطرت بن جاتا ہے۔ آخر کار وہ معاشرہ خود اپنے ہی تشدد کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنے پڑوس میں ''افغانستان'' کا جو حل ہو رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ پوری قوم جو افغان کہلاتی ہے وہ غیر شعوری طور پر قبائل میں بٹ کر ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہے اور یہ سب کچھ ایک رنگ میں مذہب کی آڑ میں کیا جا رہا ہے۔ یہ سب ایسے رجحانات ہیں جو ایک خطرناک سمت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

بہرحال اس تخریب میں ایک تعمیر کا پہلو بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ قومی سطح پر اب یہ احساس ضرور ابھر رہا ہے کہ ''تشدد'' نے ہماری قومی زندگی کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ اس احساس کو اگر ہم قومی سطح پر توانائی بخش سکیں اور ہم قومی سطح پر قوت ارادی کا مضبوط اظہار کر سکیں، ہمت اور استقلال اور حوصلے کے ساتھ اپنے ''قول'' اور ''فعل'' کے تضادات کو دور کر سکیں تو پھر ہمارے قومی کردار کی از سر نو تشکیل ہو سکتی ہے۔ قومی سطح پر ضد اور تعصب کو ہمیں خیر باد کہنا پڑے گا اور ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے اور برداشت کرنے کا جذبہ پیدا کرنا پڑے گا اور ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے اور برداشت کرنے کا جذبہ پیدا کرنا پڑے گا۔ جمہوری نقطہ نظر کا یہی آغاز اور یہی انجام بھی ہے۔ قوت برداشت اور تحمل کے بغیر ''جمہوریت'' پنپ نہیں سکتی اور اگر ''جمہوریت'' ہمارا مطمح نظر ہے تو پھر ضد اور تعصب کو ہمیں خیر باد کہنا پڑے گا۔ ''جبر'' اور ''اکراہ'' کسی صورت میں ہماری قوم کے لیے لائحہ عمل نہیں بن سکتے کیونکہ یہ ہماری مذہبی اقدار کے بھی منافی ہیں اور یہ ہمیں ماننا پڑے گا کہ ''اختلاف رائے'' ہمارے بنیادی حقوق میں سے ہے اس کے بغیر فکری آزادی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

''تسخیر'' اور ''فتح'' کا جذبہ، ایک حد تک مادی وسائل کی شکل میں جدید سائنس اور طبعی علوم اور پھر جدید ٹیکنالوجی نے ہمیں مہیا تو کر دیا لیکن عالمگیر سطح پر اب انسان کے لیے مزید نہ تو کرہ ارض کی تسخیر کے عزائم اس کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ کائنات کی بے اندازہ وسعت اور بے کرانی نے انسان کو اب یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ''تسخیر'' کا کام اب ممکن نہیں اب ''تعمیر'' کا کام شروع کرنا ہے۔ اس لیے اگلی صدی کو فزکس اور طبعیات کی صدی نہیں کہا جا رہا بلکہ بیالوجی اور حیاتیات کی صدی کا نام دیا جا رہا ہے۔ اب انسان کو عالمگیر سطح

پر صلح اور امن کی ضرورت ہے۔ تخلیق اور تعمیر کے لیے نہ کہ فتح اور تسخیر کے لیے۔ دلوں کی تسخیر اور فتح، صلح اور امن اور محبت کے ساتھ ممکن ہے نہ کہ جنگ اور تشدد کے ساتھ۔ عالمی سطح پر تمام دنیا اب کھلی مارکیٹ (Open Market) اور کھلی حکومت (Open Government) کے اصولوں کی طرف آ رہی ہے۔ غیر متعصب انداز میں ہر قسم کی اطلاع، خبر اور علوم کے فروغ کی طرف لازمی طور پر رجحان بڑھ رہا ہے۔ قومی فیصلوں کو برسر عام طے کیا جانا اور برسر عام بروئے کار لائے جانے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ مخفی منصوبوں، پوشیدہ عوامل اور رازداری کا بے جا اہتمام اب جدید طرز فکر اور جدید نظام حکومت اور ریاست سازی میں پنپ نہیں سکتا۔ اس لیے پاکستانی معاشرے کی تعمیر اور تشکیل کے لیے بھی ان امور کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری سمجھا جائے گا۔

ہمارے معاشرے میں قائد ملت لیاقت علی خاں کے قتل سے کر سقوط ڈھاکہ تک اور اس کے بعد بھی تمام کمیشن اور انکوائری کی رپورٹیں ''مخفی'' رکھنے کا رجحان، قومی شعور کو مفلوج کرنے کے مترادف ہے۔

قومی سطح پر ہمارے لیے معاشرتی نفسیات کے ایک اہم اصول سے بھی استفادہ کرنا ضروری ہے اور وہ ہے ''نقل'' اور نقالی کا جذبہ جسے نفسیات کی زبان میں Immitation کہتے ہیں۔ نقالی میں ''حسد'' اور ''رشک'' کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ ہم دوسروں کی نقالی ''محبت'' اور ''خوف'' دونوں جذبوں کے تحت کر رہے ہوتے ہیں۔ طبقات میں ''فیشن'' کی نفسیات انہی جذبات سے تشکیل پاتی ہے۔ تہذیب اور تمدن کے فروغ میں نقالی کا جذبہ بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قومی سطح پر رہنمائی کرنے والوں کو اس نفسیاتی پہلو کی طرف بھی متوجہ ہونا پڑے گا۔ ایثار، قربانی، برداشت، تحمل، عفو و درگزر، قناعت اور استغنا یہ سب وہ ''وہ خلق'' ہیں جن کی اساس ہمارے بنیادی اخلاق سے پھوٹتی ہے لیکن جب تک اوپر کی سطح سے یہ ''خلق'' معاشرے میں رائج نہ کیے جائیں آپ محض ''مدارس'' میں ان کے اسباق پڑھانے سے ان کو قومی سطح پر نافذ نہیں کر سکتے۔

حقوق سے زیادہ فرائض کی طرف متوجہ کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک نفسیاتی سطح پر ہماری لیڈر شپ ان اخلاق کو خود اپنے آپ پر لاگو نہیں کرتی۔ معاشرے کی بنیاد ''جاہ و جلال'' کے تصور پر رکھنی ہے کہ ''حسن و جمال'' پر؟ یہ بھی ایک بنیادی مسئلہ ہے

جس کو اپنے نفسیاتی پیکر میں تشکیل دینا ہے۔ حکومت کے تصور کو ''خسروانہ'' رکھنا ہے یا اسے ''غریبانہ'' بنانا ہے؟ اس سوال کا جواب بھی دینا ہے۔

جدید نفسیات اور جدید بیالوجی نے اب تو یہ تقریباً ثابت ہی کر دیا ہے کہ انسان کی پرورش اور افزائش میں اس کے ''نسائی حصے'' یا پہلو کو جتنا دیا جائے گا اتنا ہی آپ اپنے ''تشدد'' کا خود شکار ہوں گے۔ اتنا ہی آپ کے رویے اور کردار میں ''منفی'' (Negative) کا رجحان بڑھتا جائے گا۔ تخلیق اور تعمیر دراصل رحم مادر یا رحمی رشتوں سے فطری طور پر منسلک ہے۔ نسائی جذبوں سے بے اعتنائی ''جذبہ تعمیر'' کو کچلنے کا باعث بن سکتی ہے۔ پیار کا جذبہ مادری فطری جذبہ ہے۔ اس کی پرورش بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی پدرانہ تحکم اور رعب کی معاشرے میں ضرورت ہوتی ہے۔ دونوں کو اہمیت دینا صحت مند معاشرے کا احساس اپنے اندر پیدا کرنا ہوگا۔ ''تلوار'' سے آپ اپنا دفاع تو کر سکتے ہیں لیکن دوسرے کا دل نہیں جیت سکتے۔ دل جیتنے کے لیے محبت اور پیار کی ضرورت ہے۔

انسانی نفس ''اطمینان'' کے جذبے سے سرشار رہنا چاہتا ہے تو پھر اسے صلح، امن اور آشتی کی فضا چاہیے۔ اپنے اندر بھی اور اپنے باہر بھی۔ یہی زندگی کا اساس ہے۔ اور یہی انسانی زندگی کی اصل روح ہے اور یہی انسانی مستقبل کا نصب العین ہو سکتا ہے۔

کتابیات

۱- برصغیر کی اسلامی جدیدیت، پروفیسر عزیز احمد، اسٹیٹیوٹ آف اسلامک کلچر، کلب روڈ، لاہور

۲- فرائڈ ــــ نظریہ تحلیل نفسی، ڈاکٹر نعیم احمد، ''مشعل'' پاکستان، لاہور

۳- افکار سیاسی ــــ مشرق و مغرب، صلاح الدین ٹاسک، عزیز بک ڈپو، لاہور

۴- تاریخ اسلام، صاحبزادہ عبدالرسول، ایم ار برادرز، لاہور

۵- الجہاد فی الاسلام، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ایم ار برادرز، لاہور

۶- حقیقت جہاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ایم ار برادرز، لاہور

۷- مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، لاہور

1- Human Rights in Islam– Mohammad Sharif Qadri (All Pakistan Educational Conference)

2- Islamic Fundamentalism by Yousaf Chaudhri

3- Sectarianism and Ethnic Violence in Pakistan by (Musa Khan Jalalzai, Izhar Sons, 19-Urdu-Bazar, Lahore

4- History of Muslim civilization in India and Pakistan by Dr. S.M. Ikram (Institute of Islmic Culture, Club Road, Lahore, 1994).

5- The News International— 1994 (I.A. Rehman's Article).

6- Jamaat — The Politics of Religion, (Article I.A. Rehman Herald, September, 1987).

7- State of Human Rights, 1993 (94, 95, H.R.CP.

8- Pakistan and The Military — Eleven Years of Zia-ul-Haq by Shahid Javed Barki, Boolder Western Press.

9- Pakistan —— Enigma of Political Development— 1991, by Lawrence Ziring, Dawson, 1980.

10- Society of the Crime, Syed Azhar Haider Rizvi, Maktaba Faridi, Karachi, Pakistan, 1978.

11- Terriorism of International Law, by Musa Khan Jalalzai, A-one Book Centre, Urdu Bazar, Lahore.

12- Islamic Resistance in Pakistan, Edited by Anita Weise, Vanguard Books, Lahore.

13- Party Politics in Pakistan by K.K.Aziz. The National Commission on Historical and Cultural Research.

14- The Crime of Politics by Allen Francis. Harvord University Press 1974.

15- Amnesty International Report 1958 & 87.

16- Political Terriorism by Grant World Row 1982, Cambridge University Press.

17- The sub-culture of Violence by Volgang & Ferracufi 1967, English Translation)

18- Sociology of Deviant Behaviour, (1979, by M.B. Clinard).

19- Homicide & Violence by F.A. Mclintock, (1963).

20- Psychology of Ethnic Violence by Hillman. (Ardintyhal Psychology, Page 31).

21- "Women" The Second Sex. (A Philosophical appraisal by Dr. Ghazala Irfan, Punjab University).

22- Against our Will. Men Women and Rape. by Brown Mills, Penguin Books, 1977).

23- Jung. C.G. "Aspect of the Feminine" (From the Collected Works Kegan Pal Publishers).

24- Male and Female, by Margaret Meed (1949) Penguine Books 1950.

25- The Culture of Narcissism by Lasche Christopher 1979.

26- The Myth of the Hero. J. Cambell. The Hero with a Thousand Faces (Princton) 1972. The mythic Image 1975.

27- Masculinity, Rape and Religion. A Feminist Perspective by Dr. Durre S. Ahmed.

28- Ethnic Violence — Psychological Point of View by Dr. Durre S. Ahmed.

29- Crime and Criminals. (Opposing View Point, David Benler & Bruno Leone. (Greenhaven Press) San Diogo, U.S.A.

30- Seduction of Crime by Jack Katz, New York Basic Books, 1988.

31- Biological Contribution to Crime Causation. 1988 by Moffit and Sarnoff A. Melvick.

32- Corporate Crime & Violence. (San Francisco 1988 by Russell Mokhiber).

33- Murder in the Name of Allah, by H.M.T. Ahmed, (Lutterworth Press, Cambridge).

34- Munir Commission Report 1953. (Govt. of Punjab, Lahore.)

35- Civilization & its Discontents by Sigmund Freud. Hogarth Press, London 1930.

36- Depth Psychology — A Critical history. George Allen & Unwin Ltd. London 1961.

37- Group Psychology & the Analysis of the Ego, by Sigmend Freud, London, Hogarth Press, 1948.

38- Meeting of East and West by Izzat Begovick, U.S.A. 1981.

39- Man's Search for Meaning, Victor E. Frankl. Pocket Books Series, U.S.A.

40- The Formation a Persecuting Society by R.I. Moore, Blackwell Publishers, Oxford & Cambridge, U.S.A.

41- The Medieval Inquisiton by Hamilton London, 1981.

42- Culture & Communication by Leach.

43- Plagues & People, McNeill W.H. Oxford, 1977.

44- Fortune by Peters Edward (Oxford 1985).

45- The Origins of European Dissent (by Moor R.I.) Oxford 1985.